

تفہیم القرآن

(۱۶)

الاعراف

(از ازل سورہ تار کو ع ۹)

اس سورہ کا نام اعراف اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں ایک مقام پر اصحاب الاعراف کا ذکر آیا ہے۔ مگر اسے سورہ اعراف کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں اعراف کا ذکر ہے۔

اس کے مضامین پر غور کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نزول نزول تقریباً وہی ہے جو سورہ انفکاح کا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد نازل ہوئی ہو اور ممکن ہے کہ اس سے پہلے، لیکن بہر حال انداز تقریباً صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ اسی دور سے متعلق۔ لہذا اس کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس دیرپا پر ایک نگاہ ڈال دینا کافی ہو گا جو ہم نے سورہ انفکاح پر لکھا ہے۔

اس سورہ کی تقریر کام کر رہی مضمون دعوت رسالت ہے۔ ساری گفتگو کا مدعا یہ ہے کہ حجابوں کو خدا کے فرستادہ پیغمبر کی پیروی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن اس دعوت میں انذار (تنبیہ اور ڈراشے) کا رنگ زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے، کیونکہ جو لوگ مخاطب ہیں (یعنی اہل مکہ) انہیں سمجھاتے سمجھاتے ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے اور ان کی گراں گوشتی، اہٹ دھرمی اور مخالفت خدا اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ غمخیز پیغمبر کو ان سے مخاطبہ نہ کر کے دوسروں کی طرف رجوع کرنے کا حکم ملنے والا ہے۔ اس لیے تفہیمی انداز میں قبول رسالت کی دعوت دینے کے ساتھ ان کو یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ جو روش تم نے اپنے پیغمبر کے مقابلہ میں اختیار کر رکھی ہو ایسی ہی روش تم سے پہلے کی تو میں اپنے پیغمبروں کے مقابلہ میں اختیار کر کے بہت برا انجام دیکھ چکی ہیں۔ پھر چونکہ ان

محبت تمام ہونے کے قریب آگئی ہے اس لیے تقریر کے آخری حصہ میں دعوت کا رخ ان سے مٹ کر اہل کفر کی طرف پھر گیا ہے اور ایک جگہ تمام دنیا کے لوگوں سے عام خطاب بھی کیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اب ہجرت قریب ہے اور وہ دفعہ ختم پر آگیا ہے جس میں نبی کا خطاب تمام تر اپنے قریب کے لوگوں سے ہو کر رہا ہے۔

علاقہ تہذیب میں چونکہ خطاب کا رخ یہودی کی طرف بھی پھر گیا ہے اس لیے ساتھ ساتھ دعوت رسالت کے اس پہلو کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اس کے ساتھ منافقانہ روش اختیار کرتے اور سمیع و طاعت کا عہد استوار کرنے کے بعد اسے توڑ دینے، اور حق و باطل کی تمیز سے واقف ہو جانے کے بعد باطل پرستی میں مستغرق رہنے کا انجام کیا ہے۔

سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اہل آپ کے صحابہ کو حکمت سلجھنے کے متعلق چند ایہم ہدایات دی گئی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ انھیں نصیحت کی گئی ہے کہ مخالفین کی اشتعال انگیزیوں اور چیزہ و تیشوں کے مقابلہ میں صبر و ضبط سے کام لیں اور جذبات کے سببان میں مبتلا ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو اصل مقصد کو نقصان پہنچانے والا ہو۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

آل، ام، ص۔ ایک کتاب بخاری طرف نازل کی گئی ہے، پس اے محمد! تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجکت ہو۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے (مسکین کو) ڈراؤ اور ایمان

۱۰ کتاب سے مراد یہی سورہ اعراف ہے۔

۱۱ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیت کے لوگوں تک پہنچا دو اور اس بات کی پھر پروا نہ کرو کہ بخاری دعوت کے مخالفین اس کا کیا انتقام کریں گے۔ وہ بگڑتے ہیں، بگڑیں۔ مذاق اڑاتے ہیں، اڑائیں۔ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، بنائیں۔ دشمنی دہاتی اگلے صفحہ پر درج ہے

لانے والے لوگوں کو یاد دہانی ہو۔

لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اسی کی پیروی کرو، اپنے رب کو چھوڑ کر
دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ مگر تم نصیحت کم ہی مانتے ہو۔

میں اور زیادہ سخت ہوتے ہیں، جو جاتیں تم بے کھلے اس پیغام کو پہنچاؤ اور اس کی تبلیغ میں ذیاباک نہ کرو۔

جس مفہوم کے لیے ہم نے لفظ جھجک استعمال کیا ہے، اصل عبارت میں اس کے لیے لفظ حَرَج استعمال ہوا ہے لغت
میں حَرَج اس گتھی بھاڑی کو کہتے ہیں جس میں سے گزرائشکل ہو۔ دل میں حرج ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ غی لفتوں اور فراموشیوں کے
درمیان اپنا راستہ صاف نہ پا کر آدمی کا دل آگے بڑھنے سے روکے۔ اسی مفہوم کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ضعیف صلا
کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، مثلاً وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ (اے محمد میں معلوم ہے کہ جو
باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تم دل تنگ ہوتے ہو) یعنی تمہیں پریشانی لاتی ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی اور لغت
حق کا یہ حال ہے انہیں آخر کس طرح سیدھی راہ پر لایا جائے۔ قُلْعَلَّكَ تَائِبٌ لِّمَا يَوْمُحٰی (اے اللہ! وہ تائیب ہے جس نے
لَقَدْ يَتَّبِعُونَ آلَکَ اَنْتَ اَنْتَ اَوْجَاءٌ مَّعَهُمْ خُلَافٌ (تو کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تم پر وحی کیا جا رہا ہے اس میں سے کوئی
چیز تم بیان کرنے سے چھوڑ دو اور اس بات سے دل تنگ ہو کہ وہ تمہاری دعوت کے جواب میں کہیں گے اس پر کوئی خزانہ کیوں
نہ اُترا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا)

سلسلہ واضح ہے کہ اس سورد کا اصل موضوع انداز ہے، یعنی لوگوں کو رسول کی دعوت قبول نہ کرنے کے نتائج کو ڈرانا۔ اسی لیے اس کے
نازل کرنے کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے غفلوں کو جو نکلیا اور تنبیہ کیا جائے۔ یہی اہل ایمان کی تذکیر و یاد دہانی
تو عطا کی گئی فائدہ ہے جو انداز کے سلسلہ میں خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ یہ اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ اصل دعوت جو اس خطبہ میں دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو دنیا میں زندگی
بسر کرنے کے لیے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لیے جو
علم اسے درکار ہے، اور اپنے اخلاق، تہذیب، معاشرت اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصولوں کا وہ محتاج

کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ اُن پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا۔
یاد نہ کرو! یا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔ اور جب ہمارا عذاب اُن پر آگیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صلا
نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔

ہے، ان سب کے لیے اُسے صرف اللہ رب العالمین ہی کو اپنا رہنما تسلیم کرنا چاہیے اور صرف اسی ہدایت کی پیروی اختیار
کرنی چاہیے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے بھیجی ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے لیے
رجوع کرنا اور اپنے آپ کو اس کی رہنمائی کے حوالے کر دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر ایک غلط طریق کار ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ
بتاباکی کی صورت میں نکلا ہے اور ہمیشہ تباہی کی صورت ہی میں نکلے گا۔

یہاں دوبارہ دوسرے مسئلوں کا لفظ اس معنی میں استعمال ہو رہا ہے کہ انسان جس کی رہنمائی پر چلتا ہے اُسے درحقیقت اپنا
دینی و سرپرست بناتا ہے خواہ زبان سے اس کی حمد و ثنا کے گیت گاتا ہو یا اس پر لعنت کی بوچھاڑ کرتا ہو، اس کی سرپرستی کا حق
ہر بات و شخصیت اس سے منکر۔

اس لیے یعنی تمہاری ہجرت کے لیے ان قوموں کی مثالیں موجود ہیں جو خدا کی ہدایت سے منحرف ہو کر انسانوں اور شیطانوں کی
رہنمائی پر چلیں اور آخر کار اس قدر بگڑیں کہ زمین پر ان کا وجود ایک ناقابلِ برداشت لعنت بن گیا اور خدا کے عذاب نے اُن کو ان کی بنیاد
سے دینا کوہاک کر دیا۔

آخری فقرے سے مفسر دو باتوں پر متنبہ کرنا ہے۔ ایک یہ کہ طافی کا وقت گزر جانے کے بعد کسی کا جوش میں آنا اور اپنی
غلطی کا اعتراف کرنا بے کار ہے۔ سخت نادان ہے وہ شخص اور وہ قوم جو خدا کی دی ہوئی ہدایت کو غفلتوں اور سرشاریوں میں ضائع کر دے
اور مایوسی کی صدائیں کو بہرے کا قوس سے مٹنے جائے اور جوش میں گرفتار وقت گزرتے جیسے کہ گزرتے کا مضبوط ہاتھ اس پر پڑ چکا ہو
دوسرے یہ کہ افراد کی زندگیوں میں بھی اور اقوام کی زندگیوں میں بھی ایک دو نہیں بے شمار شاخیں ہیں جنہیں ہمارے سامنے گندہ لگی ہیں کہ جب کسی کی
غلط کاریوں کا پیمانہ بڑھتا ہے اور وہ اپنی ہمت کی حد کو پہنچ جاتا ہے تو پھر خدا کی گرفت اچانک سے آپگہڑی ہے اور ایک مرتبہ
پکڑ لیا جانے کے بعد چھٹکارے کی کوئی سیل اسے نہیں ملتی۔ پھر جب تالوں کے دوران میں ایک دو دفعہ نہیں سینکڑوں اور ہزاروں مرتبہ

پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں گے جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبر کی
سے بھی پوچھیں گے (کہ انھوں نے پیغامِ ربانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انھیں اس کا کیا جواب ملا)۔

یہی کچھ ہو چکا ہے تو آخر کیا فرد ہے کہ انسان اسی غلطی کا بار بار اعادہ کیے چلا جائے اور ہوش میں آنے کے لئے سب سے آخری عست
کا انتظار کرتا رہے جب ہوش میں آنے کا کوئی فائدہ حسرت و اندوہ کے سوا نہیں بنتا۔

۱۱۔ باز پرس سے مراد درقیامت کی باز پرس ہے۔ بدکار افراد اور قوموں پر دنیا میں جو غضب آتا ہے وہ دراصل ان کے
اعمال کی باز پرس نہیں ہے اور نہ ان کے جرائم کی بڑی سزا ہے، بلکہ اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی مجرم جو چھوٹا پھر بڑا
ہو، اچانک گرفتار کر لیا جائے اور مزید ظلم و فساد کے مواقع اس سے چھین لیے جائیں۔ تاریخِ انسانی ان گرفتاریوں کی بے شمار
نظردوں سے بھری پڑی ہے اور یہ نظریں اس بات کی ایک مزید علامت ہیں کہ انسان دنیا میں مشربے ہمار کی طرح نہیں
ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے، بلکہ اُد پر کوئی طاقت ہے جو ایک حد فاصل تک اسے ڈھیل دیتی ہے، تنبیہات و تنبیہات بھیجتی
ہے کہ اپنی شرارتوں سے باز آجائے، اور جب وہ کسی طرح باز نہیں آتا تو اسے اچانک پکڑ لیتی ہے۔ پھر اگر کوئی اس تاریخی تجربہ پر غور
کرے تو باسانی نتیجہ بھی نکال سکتا ہے کہ جو فرماںِ روا اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے اس نے ضرور ایسا ایک وقت ضرور
کیا ہو گا جہاں سارے مجرموں پر عدالت قائم ہوگی اور ان سے ان کے اعمال کی باز پرس کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اُد پر
کی آیت کو جس میں دنیوی عذاب کا ذکر کیا گیا ہے، بعد دلی آیت کے ساتھ لفظ "پس" کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، گویا اس دنیا
عذاب کا بار بار واقع ہونا آخرت کی باز پرس کے یقیناً واقع ہونے پر ایک دلیل ہے۔

۱۲۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کی باز پرس سراسر رسالتِ نبی کی بنیاد پر ہوگی۔ ایک طرف پیغمبروں سے پوچھا جائے گا
کہ تم نے نوعِ انسانی تک خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے کیا کچھ کیا اور دوسری طرف جن لوگوں تک رسولوں کا پیغام پہنچا ان سے
سوال کیا جائے گا کہ اس پیغام کے ساتھ تم نے کیا برتاؤ کیا جس شخص یا جن انسانی گروہوں تک یہاں کا پیغام نہ پہنچا ہوا ان کے
بارے میں تو قرآن ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ ان کے مقدمہ کا کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا
ہے لیکن جن اشخاص و اقوام تک پیغمبروں کی تعلیم پہنچ چکی ہے ان کے متعلق قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ اپنے کفر و انکار اور

پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشتِ ان کے آگے پیش کر دیں گے، آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔ اور وزنِ اس، وزنِ حق ہو گا، جن کے پڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پڑے ہلکے رہیں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ جتنا کرنا رہے تھے۔

ہم نے تھیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بایا اور تمہارے لیے یہاں سامانِ زلیست فراہم کیا، مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔

ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تھیں صورت دی، پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ

فرق واذانی کے لیے کوئی حجت نہ پیش کر سکیں گے اور ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ حسرت و ندامت کے ساتھ ہاتھ دھو کر جہنم کی راہ لیں۔

۱۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس روز خدا کی میزانِ عدل میں وزن اور حق دونوں ایک دوسرے کے ہم معنی ہوں گے۔ حق کے ساتھ چیزیں وزن نہ ہو گی اور وزن کے سوا کوئی چیز حق نہ ہو گی۔ جس کے ساتھ جتنا حق ہو گا اتنا ہی وہ با وزن ہو گا اور فیصلہ جو کچھ بھی ہو گا وزن کے لحاظ سے ہو گا، کسی دوسری چیز کا وزن برابر لحاظ نہ کیا جائے گا۔ باطل کی پوری زندگی خواہ وہ دنیا میں کتنی ہی طویل و عریض رہی ہو اور کتنے ہی مظاہر نشاندار کا زمانہ اس کی پشت پر ہوں، اس ترازو میں سراسر بے وزن قرار پائے گی۔ باطل پرست جب اس میزان میں تو لے جائیں گے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ دنیا میں جو کچھ مدتِ عمر کرتے رہے وہ سب ایک پرکھ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا۔ یہی بات ہے جو سورہ کہف کی آخری آیات میں فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی میں سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتے رہے اور اللہ کی آیات سے انکار کر کے جن لوگوں نے یہ سمجھتے ہوئے کام کیا کہ انجام کار کوئی آخرت نہیں ہے اور کسی کو حساب نہیں دینا ہے ان کے کا زمانہ زندگی کو ہم آخرت میں کوئی وزن نہ دیں گے۔

۲۔ ان مضمون کو یوں سمجھیے کہ انسان کا کا زمانہ زندگی دو مہینوں میں تقسیم ہو گا۔ ایک مثبت پہلو اور دوسرا منفی پہلو مثبت پہلو

میں صرف حق کو جاننا اور حق کی پیروی میں حق ہی کی خاطر کام کرنا شمار ہو گا اور آخرت میں اگر کوئی چیز وزنی اور قسمتی ہو گی تو وہ

© rasailoraid.com

(بقیہ حاشیہ) دوسرے انداز میں بیان کیے گئے ہیں، یعنی پہلے مٹی سے ایک بشر کی تخلیق، پھر اس کا تسویہ، یعنی اس کی شکل و صورت بنانا اور اس کے اعضاء اور اس کی قوتوں کا تناسب قائم کرنا، پھر اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک کر آدم کو وجود میں لے کر اس کی مضمون کو سورہ حجر رکوع ۳ میں بایں الفاظ ادا کیا گیا ہے: **وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلَٰصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ۖ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوْا أَلَمَٰیۤعِيۡنَ** اور تصور کر دو اس وقت کا جب کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں خمیر اٹھی ہوئی مٹی کے ٹکڑے سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کروں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔

تخلیق انسانی کے اس آغاز کو انکی نفسی کیفیت کے ساتھ سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ہم اس حقیقت کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتے کہ موادِ راضی سے بشر کس طرح بنایا گیا، پھر اس کی صورت گری اور تعدیل کیسے ہوئی، اور اس کے اندر روح پھونکنے کی نوعیت کیا تھی، لیکن بہر حال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید انسانیت کے آغاز کی کیفیت ان نظریات کے خلاف بیان کرتا ہے جو موجودہ زمانہ میں سائنس کے نام سے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان نظریات کی رو سے انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے مختلف تدریج سے ترقی کرتا ہوا مرتبہ انسانیت تک پہنچا ہے اور اس تند و بکی ارتقار کے طویل خط میں کوئی نقطہ حاصل ہوا نہیں ہو سکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کو ختم قرار دے کر نوعِ انسانی کا آغاز تسلیم کیا جائے۔ بخلاف اس کے قرآن میں بتایا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت سے ہوا ہے اُس کی تاریخ کسی غیر انسانی حالت سے قطعاً کوئی رشتہ نہیں رکھتی، وہ اول روز سے انسان ہی بنایا گیا تھا اور خدا نے کامل انسانی شعور کے ساتھ پوری روشنی میں اُس کی ارضی زندگی کی ابتدا کی تھی۔

انسانیت کی تاریخ کے متعلق یہ دو مختلف نقطہ نظر ہیں اور ان سے انسانیت کے دو بالکل مختلف تصور پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تصور کو اختیار کیجیے تو آپ کو ان اصل حیوانی کی ایک فرع نظر آئے گا، اس کی زندگی کے جلد قوانین، حتیٰ کہ اخلاقی قوانین کے لیے بھی آپ بنیادی اصول ان قوانین میں تلاش کریں گے جن کے تحت حیوانی زندگی چل رہی ہے، اور اُس کے لیے حیوانات کا سطر عمل آپ کو بالکل ایک نظری طرزِ عمل معلوم ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ جو فرق انسانی طرزِ عمل اور حیوانی طرزِ عمل میں آپ

پوچھا: ”تجھے کس چیز نے بچہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟“
 بولا: ”میں اُس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسے مٹی سے۔“
 فرمایا: ”اچھا تو یہاں سے نیچے اتر۔ تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھنڈ کرے۔ نکل جا کہ حقیقت
 تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔“

دیکھنا چاہیں گے وہ بس تنہا ہی ہو گا کہ حیوانات جبکہ آلات اور صنائع اور تمدنی آرائشوں اور تہذیبی نقش و نگار کے بغیر کرتے
 ہیں، انسان وہی سب کچھ ان چیزوں کے ساتھ کرے۔ اس کے برعکس دوسرا تصور اختیار کرنے ہی آپ انسان کو جانور کے
 بجائے ”انسان“ ہونے کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ آپ کی نگاہ میں وہ حیوان ناطق ”یا“ تمدن جانور ”Social
 animal“ نہیں ہو گا بلکہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہو گا۔ آپ کے نزدیک وہ چیز جو اس سے دوسری مخلوقات سے
 ممتاز کرتی ہے اس کا نطق یا اس کی اجتماعییت نہ ہو گی بلکہ اس کی اخلاقی ذمہ داری اور اختیارات کی امانت ہو گی جسے خدا
 اس کے سپرد کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس طرح انسانیت اور اس کے جملہ متعلقات پر آپ کی نظر
 اوپر کے زاویہ نظر سے یک سر مختلف ہو جائے گی۔ آپ انسان کے لیے ایک دوسری فلسفہ حیات اور ایک دوسری نظام اخلاق
 و تمدن و قانون طلب کرنے لگیں گے اور اس فلسفہ اور اس نظام کے اصول و مبادی تلاش کرنے کے لیے آپ کی نگاہ خود بخود
 عالم اہل کے بجائے عالم بالائی طرف اٹھنے لگے گی۔

۱۔ اصل میں لفظ حَایِرِیْن استعمال ہوا ہے۔ حَایِرِیْن کے معنی ہیں ادا خضی یا نذل، یعنی وجہ نزلت اور مغر اور چھوٹی
 حیثیت کو خود اختیار کرے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ بندہ اور مخلوق ہونے کے باوجود تیرا بڑائی کے گھنڈ
 میں مبتلا ہونا اور اپنے رب کے حکم سے اس بنا پر سرتابی کرنا کہ اپنی عزت و برتری کا تصور تو نے خود قائم کر لیا ہے اس کے
 لحاظ سے وہ حکم تجھے اپنے لیے موجب توہین نظر آتا ہے، یہ خدا اصل یہ معنی رکھتا ہے کہ تو خود اپنی ذلت چاہتا ہے۔ بڑائی کا جھوٹا
 پندار، عزت کا بے بنیاد ادعا، اور کسی ذاتی استحقاق کے بغیر اپنے آپ کو خواہ خواہ برتری کے منصب پر فائز سمجھ بیٹھنا، نیچے بڑا اور
 ذی عزت اور بزرگ نہیں بنا سکتا بلکہ یہ تجھے چھوٹا اور ذلیل اور پستی ہی بنائے گا اور اپنی اس ذلت و خودی کا سبب تو آپ ہی ہو گا۔

بولاً: ”مجھے اُس دن تک جہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔“
فرمایا: ”مجھے جہلت ہے۔“

بولاً: ”بس تو حیرت تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔“

اسی وہ جہلچ تھا جو ابلیس نے خدا کو دیا۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ جہلت جو آپ نے مجھے قیامت تک کے لیے دی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر میں یہ ثابت کرنے کے لیے پورا زور صرف کر دوں گا کہ ان اس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو آپ نے میرے مقابلہ میں اسے عطا کی ہے۔ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ یہ کیسا ناشکرا، کیسا نیک حرام، کیسا احسان فراموش ہے۔ یہ جہلت جو شیطان نے مانگی تھی اور جو خدا نے اسے عطا فرمادی اس سے ہر شخص وقت ہی نہیں ہے بلکہ اُس کام کو بھی ہے جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ یعنی اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے ان کو پہکانے اور اس کی مکروریوں سے فائدہ اٹھا کر اس کی ناہی ثابت کرنے کا موقع دیا جائے، اور یہ موقع اللہ تعالیٰ نے اسے دے دیا۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل رکوع ۷ میں اس کی تصریح ہو کر اللہ تعالیٰ نے اسے اختیار دے دیا کہ آدم اور اس کی اولاد کو راہ راست سے ہٹا دینے کے لیے جو جو چاہیں وہ چلنا چاہتا ہے۔ پچلے، ان چال بازیوں سے اسے روکا نہیں جائے گا بلکہ وہ سب اہل لکھی رہیں گی جن سے وہ ان کو فتنہ میں ڈالنا چاہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگا دی کہ اِنِّیْ لَکُمْ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ، یعنی میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار نہ ہوگا، تو صرف اس بات کا مجاز ہوگا کہ ان کو غلط فہمیوں میں ڈالے، جھوٹی امیدیں دلائے، بدی اور گمراہی کو ان کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرے، ان کو ان اور فائدوں کے سبب راہ دکھا کر ان کو غلط راستوں کی طرف دھوت دے مگر یہ طاقت تجھے نہیں دی جائے گی کہ انھیں زبردستی اپنے راستے پر کھینچ لے جائے اور اگر وہ راہ راست پر چلنا چاہیں بھی تو نہ چلنے دے یہی وہ بات ہے جو سورہ ابراہیم رکوع ۴ میں فرمائی گئی ہے کہ قیامت میں عدالت الہی سے فیصلہ صادر ہونے کے بعد شیطان اپنے پیروانوں سے کہے گا وَ مَا کَانَ لَیْ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْکُمْ فَاَسْتَجَبْتُمْ

فرمایا، "نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا! یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے ان سے اور تجھ سے جہنم کو بھر دوں گا۔ اور اے آدم! تو اور تیری بیوی، دونوں اس جنت میں رہو، جہاں جس چیز کو تمھارا جی چاہے کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس نہ بھٹکنا اور نہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔"

پھر شیطان نے ان کو بہکایا تاکہ ان کی ٹمر لگا ہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے۔ اس نے ان سے کہا "تمھارے بچے تمھیں جو اس درخت سے روک رہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا تمھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔" اور اس نے قسم کھائی ان سے کہا کہ میں تمھارا سچا خیر خواہ ہوں۔

اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں فرشتے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انھوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔

تب ان کے رب نے انھیں پکارا "کیا میں نے تمھیں اس درخت سے روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے؟"

یٰۤاٰدَمُ اَنْزَلْنٰكَ مِنْهَا فَاخْرُجْ مِنْهَا وَتَكُنْ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ
 کیا ہو، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ تمھیں اپنی راہ پر بلایا اور تم نے میری دعوت قبول کر لی، لہذا اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کردہ۔

اور یہ جو شیطان نے خدا پر الزام مانا کیا ہے کہ تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اپنی محبت کی ذمہ داری خدا پر ڈالتا ہے۔ اس کو شکایت ہے کہ آدم کے آگے مجھ سے کاظم دے کر تو نے مجھے حق سے ڈالا اور میرے نفس کے حکم کو ٹھیس لگا کر مجھے اس حالت میں مبتلا کر دیا کہ میں نصیری نافرمانی کی گویا بدن جنت کی خواہش یہ تھی کہ اس کے نفس کی چوڑی پکڑی نہ جاتی بلکہ جس پند پر غلط اور جس سرکشی کو اس نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دیا جاتا۔ یہ ایک کھلی

دونوں لول اٹھے" اے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

جوئی سیفیانہ بات تھی جس کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے سونے سے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔
اس قصے سے چند اہم حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) انسان کے اندر شرم و بجا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اولین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو محفوظ رکھنے کے سانسے کھولنے میں آدمی کو فطرۃً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن میں بتاتا ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقاء سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ انسانی چیز ہے، جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے، بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اول روز سے انسان میں موجود تھی۔

(۲) شیطان کی پہلی چال جو اس نے انسان کو فطرت انسانی کی سیدھی راہ سے ہٹانے کے لیے چلی، یہی تھی کہ انسان کے اس جذبہ شرم و بجا پر ضرب لگائے اور برنگی کے راستے سے اس کے لیے فحش کا دروازہ کھولے اور اس کو صنفی معاملات میں بدر راہ کر دے۔ بالفاظ دیگر اپنے حریف انسان کے محاذ میں ضعیف ترین مقام جو اس نے حملہ کے لیے تلاش کیا وہ اس کی زندگی کا صنفی پہلو تھا، اور پہلی ضرب جو اس نے لگائی وہ اس محافظ فیصل پر لگائی جو شرم و بجا کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھی تھی۔

(۳) یہ بھی انسان کی عین فطرت ہے کہ وہ برائی کی بھلی دعوت کو کم ہی قبول کرتا ہے۔ عموماً اسے اپنے جال میں پھانسنے کے لیے داعی شر کو خیر خواہی کے جھیس ہی میں آنا پڑتا ہے۔

(۴) انسان کے اندر معالی امور مثلاً بشریت، بالائے مقام پر پہنچنے یا حیات جاویداں حاصل کرنے کی ایک فطری پیاس موجود ہے اور شیطان کو اسے قریب دینے میں پہلی کامیابی اسی ذریعہ سے ہوئی کہ اس نے انسان کی اس خواہش سے پیل کرنا۔ شیطان کا سب سے زیادہ چلتا ہوا حربہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو بندی پر لے جانے اور موجودہ حالت سے بہتر حالت پر پہنچا دینے کی امید دلاتا ہے اور پھر اس کے لیے وہ راستہ پیش کرتا ہے جو اسے اُٹا ہستی کی طرف لے جائے۔

(دقیقہ حاشیہ) (۵) عام طور پر یہ مشہور ہو گیا ہے کہ شیطان نے پہلے حضرت حوا کو آدم فریب میں گرفتار کیا اور پھر انھیں حضرت آدم کو پھانسنے کے لیے آواز کا بنایا، قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ شیطان نے دونوں کو دھوکا دیا اور دونوں اس سے دھوکا کھا گئے۔ بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت حوا کے متعلق اس مشہور روایت نے دنیا میں عورت کے اخلاقی، قانونی اور معاشرتی مرتبہ کی گرا لے میں کتنا زبردست حصہ لیا ہے وہی قرآن کے اس بیان کی حقیقی قدر و قیمت سمجھ سکتے ہیں۔

(۶) یہ گمان کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے کہ شجر ممنوعہ کا نرا پختے ہی آدم و حوا کے ستر کھل جانا ان درخت کی کسی خاصیت کا نتیجہ تھا۔ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سوا کسی اور چیز کا نتیجہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کا اپنے انتظام سے ڈھانکا تھا۔ جب انھوں نے حکم کی خلاف ورزی کی تو خدا کی حفاظت ان سے ہٹا لی گئی، ان کا پردہ کھول دیا گیا اور انھیں خود ان کے اپنے نفس کے حوالے کر دیا گیا کہ اپنی پردہ پوشی کا انتظام خود کریں اگر اس کی ضرورت سمجھتے ہیں، اور اگر ضرورت نہ سمجھیں یا اس کے لیے سچی نہ کریں تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کس حال میں پھرتے ہیں یہ رہ گیا ہمیشہ کے لیے اس حقیقت کا مظاہرہ تھا کہ ان جب خدا کی نافرمانی کیے گا تو دیر یا سویر، اس کا پردہ کھل کر رہے گا۔ اور یہ کہ انسان کے ساتھ خدا کی تائید و حمایت اسی وقت تک رہے گی جب تک وہ خدا کا مطیع فرمان رہے گا، اطاعت کے حدود سے قدم باہر نہ نکالنے کے بعد اسے خدا کی تائید ہرگز حاصل نہ ہوگی بلکہ اسے خود اس کے اپنے نفس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ وہی مضمون ہے جو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اور اسی کے متعلق حضور نے دعا فرمائی ہے کہ اللہم رحمتہ اسرجو فلا تکلخی الی نفسی طرقتا عین (خدا یا میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں پس مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے نفس کے حوالے نہ کر)۔

دے، شیطان یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ انسان اس فیصلہ کا مستحق نہیں ہے جو اس کے مقابل میں انسان کو دی گئی ہے۔ لیکن پہلے ہی معرکے میں اس نے شکست کھائی۔ اس میں شک نہیں کہ اس معرکے میں انسان اپنے رب کی فرمان برداری کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا اور اس کی یہ کمزوری ضرور ظاہر ہو گئی کہ وہ اپنے حریف کے فریب میں آکر

(بقیہ حاشیہ) اطاعت کی راہ سے ہٹ سکتا ہے، مگر ہر حال اس اولین مقابلہ میں یہ قطعی ثابت ہو گیا کہ انسان اپنے خدائی مرتبہ میں ایک افضل مخلوق ہے۔ اولاً شیطان اپنی بڑائی کا خود مدعی تھا، اور انسان نے اس کا دعویٰ آپ نہیں کیا بلکہ بڑائی اسے دی گئی۔ ثانیاً شیطان نے خالص غرور و تکبر کی بنا پر اللہ کے لڑکی نافرمانی آپ اپنے اختیار سے کی، اور انسان نے نافرمانی کو خود اختیار نہیں کیا بلکہ شیطان کے بہکانے سے کیا، شر کی کھلی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ داعی شر کو داعی خیر بن کر اس کے سامنے آنا پڑا، پستی کی طرف وہ پستی کی طلب میں نہیں گیا بلکہ اس دھوکے میں مبتلا ہو کر گیا کہ یہ راستہ اسے بڑی کی طرف لے جائے گا۔ ثالثاً شیطان کو حبیہ تنبیہ کی گئی تو وہ اپنے قصور کا اعتراف کرنے اور بندگی کی طرف پلٹ آنے کے بجائے نافرمانی پر اور زیادہ جم گیا، اور جب انسان کو اس کے قصور پر تنبیہ کیا گیا تو اس نے شیطان کی طرح سرکشی نہیں کی بلکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ نادام ہوا، اپنے قصور کا اعتراف کر کے بغاوت سے اطاعت کی طرف پلٹ آیا اور معافی مانگ کر اپنے رب کے دامن رحمت میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔

(۸) اس طرح شیطان کی راہ امدادہ راہ حوائف انسان کے لائق ہے، دونوں ایک دوسرے سے بالکل متمیز ہو گئیں۔ خالص شیطانی راہ یہ ہے کہ بندگی سے منہ موڑے، خدا کے مقابلہ میں سرکشی اختیار کرے، متنبہ کیے جانے کے باوجود چودے استکبار کے ساتھ اپنے باغیانہ طرز عمل پر اصرار کرے چلا جائے، اور جو گناہات کی راہ چل رہے ہوں ان کو بھی بہکانے اور مصیبت کی راہ پر لے آنے کی کوشش کرے۔ بخلاف اس کے جو راہ انسان کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اول تو وہ شیطانی اطاعت کی مزاحمت کرے اور اپنے دشمن کی چالوں کو سمجھنے اور ان سے بچنے کے لیے ہر وقت چوکنا رہے، لیکن اگر کبھی اس کا قدم بندگی و اطاعت کی راہ سے ہٹ بھی جائے تو اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی غلامت و ساری کے ساتھ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے اور اس قصور کی تلافی کر دے جو اس سے سرزد ہو گیا ہے۔ یہی وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اس حقے سے یہاں دینا چاہتا ہے۔ ذہن نشین یہ کرنا قصود ہے کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو شیطان کی راہ ہے۔ یہ تمہارا خدائی ہدایت سے بے نیاز ہو کر شیاطین جن و انس کو اپنا ولی و سرپرست بنانا، اور یہ تمہارا پیہ پیہ فیہات کے باوجود اپنی غلطی پر اصرار کر کے چلے جانا، یہ دو اہل خالص شیطانی رویہ ہے۔ تم اپنے اذلی دشمن کے دام میں گرفتار ہو گئے ہو اور اس سے مکمل شکست کھا رہے ہو۔ اس کا انجام پھر وہی ہے جس سے خود شیطان دوچار ہونے والا ہے۔ اگر تم حقیقت

فرمایا، "اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمہارے لیے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامانِ ریت ہے۔" اور فرمایا، "وہیں تم کو حبس اور وہیں مرنا ہے اور وہیں سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا۔"

ع

اسے اولادِ آدمؑ ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور میں خود اپنے دشمن نہیں ہو گئے ہو اور کچھ بھی ہوش تم میں باقی ہے تو سن لو اور وہ راہ اختیار کرو جو آخر کار تمہارے باپ اور تمہاری ماں آدم و حواؑ نے اختیار کی تھی۔

اسے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو جنت سے اتر جانے کا حکم سزا کے طور پر دیا گیا تھا۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اس کی تشریح کی گئی ہے کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور انہیں معاف کر دیا۔ لہذا اس حکم میں سزا کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ اس منشا کی تکمیل ہے جس کے لیے ان کو پیدا کیا گیا تھا۔ اس کی تشریح ہم سورہ بقرہ، ذکوعہم کے حواشی میں کر چکے ہیں۔

اسے یہاں تھوڑا آدم و حوا کے ایک خاص پہلو سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اہل عرب کے سامنے خود ان کی اپنی زندگی کے اندیشہ خانی افکار کے ایک نمایاں ترین اثر کی نشان دہی فرمائی جا رہی ہے۔ یہ لوگ لباس کو صرف زینت اور موسمی انورات سے جسم کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے تھے، لیکن اس کی سب سے پہلی بنیادی غرض، یعنی جسم کے قابلِ شرم حصوں کی پردہ پوشی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ انہیں اپنے سر و سروں کے سامنے کھول دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ برہنہ منظر عام پر نہ لینا، راہ چلتے وقت حاجت کے لیے بیٹھ جانا، ازار کھل جانے تو ستر کے بے پردہ ہو جانے کی پروا نہ کرنا ان کے شب و روز کے معمولات تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں سے بکثرت لوگ کعبہ کے گرد برہنہ طواف کرتے تھے اور اس معاملہ میں ان کی عورتیں ان کے مردوں سے بھی کچھ زیادہ بے حیا تھیں۔ ان کی نگاہ میں یہ ایک مذہبی فعل تھا اور وہ خیر سمجھ کر اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ پھر چونکہ یہ کوئی عروہ ہی کی خصوصیت نہ تھی، دنیا کی اکثر قومیں اسی بے حیائی میں مبتلا رہی ہیں اور آج تک ہیں اس لیے خطابِ اہل عرب کے یہ خاص نہیں بلکہ عام ہے اور سارے بنی آدم کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھو، یہ شیطانی افواہ کی ایک کھلی ہوئی علامت تمہاری زندگی میں موجود

تھارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہوا اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔ اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتر دیا۔ تمہارے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے۔ وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ان خیالین کو ہم نے ان لوگوں کا سر پر بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

ہم اپنے رب کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اور اس کے رسولوں کی دعوت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا اور اس نے تمہیں انسانی فطرت کے راستے سے ہٹا کر اسی بے حیائی میں مبتلا کر دیا جس میں وہ تمہارے پہلے باپ اور ماں کو مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ اس پر غور کرو تو یہ حقیقت تم پر کھل جائے کہ رسولوں کی رہنمائی کے بغیر تم اپنی فطرت کے ابتدائی مطالبات تک کو نہ سمجھ سکتے ہو اور نہ پورا کر سکتے ہو۔

۱۔ ان آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس سے چند اہم حقیقتیں نکھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔

اول یہ کہ لباس انسان کے لیے ایک مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ اللہ نے انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح کوئی پوشش پیدا نہ کی مگر پر نہیں رکھی ہے۔ بلکہ جی اور شرم کا مادہ اس کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ انسان کے اعضائے صغی کو اس کے لیے محض اعضائے صغی ہی نہیں بلکہ مَوَاقِف بھی بنایا ہے جس کے معنی عربی زبان میں ایسی چیز کے ہیں جس کے اعلان و اظہار کو آدمی قبیح سمجھے۔ پھر اس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے کوئی بنا بنایا لباس اس کو نہیں دیا ہے بلکہ اس کی فطرت پر لباس کا اہام کیا ہے (أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِسَاءَ) تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر اپنی فطرت کے اس مطالبے کو سمجھے اور پھر اللہ کے پیدا کردہ مواد سے کام لے کر اپنے لیے لباس فراہم کرے۔

دوم یہ کہ اس فطری اہام کی دوسری طرف انسان کے لیے لباس کی اخلاقی ضرورت مقدم ہے، یعنی یہ کہ وہ اپنی مَوَاقِف کو ڈھکے اور اس کی طبعی ضرورت موخر ہے، یعنی یہ کہ اس کا لباس اس کے لیے ہمیشہ جسم کی آرائش اور موسمی اثرات سے بدن کی

یہ لوگ جب کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا ہی اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہو اللہ سبے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیتا، کیا تم اللہ کا نام

حفاظت کا درجہ ہو۔ اس باب میں بھی فطرۃ ان کا معاملہ حیوانات کے برعکس ہے۔ ان کے لیے پوشش کی اصل غرض صرف اس کا ریش ہونا ہے۔ رہا اس کا ستروش ہونا تو ان کے اعضا صنفی سرے سے سوآۃ ہی نہیں ہیں کہ انہیں چھپانے کے لیے حیوانات کی حیثیت میں کوئی داعیہ موجود ہو اور اس کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ان کے اجسام پر کوئی لباس پیدا کیا جائے یا ان کی فطرتوں پر بند ریۃ الہام نازل کیا جائے۔ لیکن انسانوں نے جب شیطان کی رہنمائی قبول کی تو معاملہ پھراٹ گیا۔ اُس نے اپنے ان شگردوں کو اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ تمہارے لیے لباس کی ضرورت بعینہ وہی ہے جو حیوانات کے لیے سریش کی ضرورت ہے، رہا اس کا سوآۃ کچھپانے والی چیز ہونا، تو یہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ جس طرح حیوانات کے اعضاء سوآۃ نہیں ہیں اسی طرح تمہارے یہ اعضاء بھی سوآۃ نہیں محض اعضاء صنفی ہی ہیں۔

تسوم یہ کہ ان کے لیے لباس کا صرف ستروش اور وسیع زینت و حفاظت ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت اس معاملہ میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو، یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو زینت میں بھی حد سے بڑھا ہو یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہو۔ نہ ہو، خود غرور اور تکبر و ریا کی نشان دہی ہو، سو سے بھی نہ ہو، اور پھر ان ذہنی امراض کی نمائندگی بھی نہ کرے جو جن کی بنا پر مرد و زنانہ پن اختیار کرتے ہیں، عورتیں مردانہ پن کی نمائندگی کرتی ہیں اور ایک قوم دوسری قوم کے متاثرہ بننے کی کوشش کیے خود اپنی ذلت کا زندہ اشتہار بن جاتی ہے۔ لباس کے معاملہ میں اس خیر مطلوب کو پہنچنا تو کسی طرح ان لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جنہوں نے انبیاء علیہم السلام پایاں لاکر اپنے آپ کو بالکل خدا کی رہنمائی کے حملے میں کر دیا جو یہ خدا کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو شیاطین ان کے سر پرست بنا دیے جاتے ہیں، پھر یہ شیاطین ان کو کسی نہ کسی غلطی میں مبتلا کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔

چہارم یہ کہ یہ لباس کا معاملہ بھی اللہ کی ان بے شمار نشانیوں میں سے ایک ہے جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور حقیقت تک پہنچنے میں ان کی مدد کرتی ہیں بشرطیکہ ان خود ان سے سبق لینا چاہے۔ اوپر جن حقائق کی طرف ہم تے

نے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں؟ اے محمد ان سے کہو میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے، اور اس کا حکم تو یہ ہے کہ بر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھو اور اسی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھ کر جس طرح اس نے تمہیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کیے جاؤ گے۔ ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے مگر دوسرے گروہ پر اگر اسی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ انہوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنالیا ہے اور وہ بھگ رہے ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں۔

اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو

اشارہ کیا ہے انہیں اگر تامل کی نظر سے دیکھا جائے تو بآسانی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ باس کس حیثیت سے انسان کیلئے اللہ تعالیٰ کا ایک ہم نشان ہے۔

﴿حاشیہ ۳۲﴾ اسی اشارہ ہے اپنی عرب کے برہنہ طواف کی طرف۔ جیسا کہ ہم اوپر کہ چکے ہیں، وہ اس صفت کے ساتھ طواف کرنے کو ایک مذہبی فعل سمجھتے تھے اور ان کا قیل تھا کہ اللہ نے ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے

﴿حاشیہ صوفیاء﴾ اسی مطلب یہ ہے کہ خدا کے دین کو تمہاری بنیادوں سے کیا متعلق۔ اس سے جس دین کی تعلیم دی ہے اس کے بنیادی اصول تو یہ ہیں کہ:-

انسان اپنی زندگی کو عدل و راستی کی بنیاد پر قائم کرے

عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھے، یعنی خدا کے سوا کسی اور کی زندگی کا تبتہ تکس کی عبادت میں نہ ہو موجود حقیقی کے سوا کسی دوسرے کی طرف اطاعت و غلامی اور بجز دنیا کا رخ نہ کرے۔

رہنمائی اور تائید و نصرت اور نگہبانی و حفاظت کے لیے خدا ہی سے دعا مانگے، مگر یہ دعا صرف اسی حالت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ آدمی پہلے اپنے دین کو خدا کے لیے خالص کر چکا ہو، یہ نہ ہو کہ زندگی کا سارا نظام و کفر و شرک اور مصیبت اور زندگی اخبار پر چلایا جا رہا ہو اور خدا سے مانگی جائے کہ اے خدا! بیخداوت جو ہم تجھ سے کر رہے ہیں اس میں ہماری مدد فرما

ع

اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اے محمد! ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان

اور اس بات پر یقین رکھے کہ جس طرح اس دنیا میں وہ پیدا ہوا ہے اسی طرح ایک دوسرے عالم میں بھی اس کو

پیدا کیا جائے گا۔

مثلاً یہاں زینت سے مراد مکمل لباس ہے۔ خدا کی عبادت میں کھڑے ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے

کہ آدمی محض اپنا ستر چھپائے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنا پورا لباس پہنے جس میں سستہ خوشی بھی ہو اور زینت

بھی یہ حکم اس غلط رویہ کی تردید کے لیے ہے جس پر جہلاً اپنی عبادتوں میں عمل کرتے رہے ہیں اور آج تک کر رہے ہیں۔

مجھے ہیں کہ برہنہ یا نیم برہنہ ہو کر اور اپنی میٹھتوں کو بگاڑ کر خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔ اس کے برعکس خدا کہتا ہے کہ اپنی

زینت سے راستہ ہو کر ایسی وضع میں عبادت کرنی چاہیے جس کے اندر برکت ہو، کیا، ناستستگی کا بھی ثابہ ہو۔

مثلاً یعنی خدا کو تنہا ری فائدہ کشی اور طہبات رزق سے محرومی عزیز نہیں ہے کہ اس کی بندگی بجالانے کے لیے یہ کسی

درجہ میں بھی مطلوب ہو، بلکہ اس کی میں خوشی یہ ہے کہ تم اس کے بچے ہو، پاک رزق سے مستحق ہو۔ اس کی شریعت میں اصل

گناہ یہ ہے کہ آدمی اس کی متوا کر دہ حدوں سے تجاوز کرے خواہ یہ تجاوز حلال کو حرام کہ لینے کی شکل میں ہو یا حرام کو حلال

کرنے کی شکل میں۔

مثلاً مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو دنیا کی ساری زینتیں اور پاکیزہ چیزیں بندوں ہی کے لیے پیدا کی ہیں، اس

لیے اللہ کا منشاء تو بہر حال یہ نہیں جو سکتا کہ انہیں بندوں کے لیے حرام کر دے۔ اب اگر کوئی مذہب یا کوئی نظام خلق

و معاشرت ایسا ہے جو انہیں حرام یا قابل نفرت دیا ارتقاے روحانی میں سب راہ قرار دیتا ہے تو اس کا یہ فعل خود ہی

اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔

لانے والوں کے لیے ہیں، اور قیامت کے روز تو خالصتہً انہی کے لیے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔

اے محمد! ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام خواہ کھلے ہوں یا چھپے۔ اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی کو شریک کر جس کے لیے اس نے کوئی سزا نازل نہیں کی اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات

کہ یعنی حقیقت کے اعتبار سے تو خدا کی پیدا کردہ تمام چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی اہل ایمان ہی کے لیے ہیں، کیونکہ وہی خدا کی وفادار رعایا ہیں اور حق ملک صرف ملک حلالوں ہی کو پہنچتا ہے، لیکن دنیا کا موجودہ انتظام چونکہ آزمائش اور جہد کے اصول پر قائم کیا گیا ہے اس لیے یہاں اکثر خدا کی نعمتیں ملک حراموں پر بھی تقسیم ہوتی رہتی ہیں اور بسا اوقات ملک حلالوں سے بڑھ کر انھیں نعمتوں سے نواز دیا جاتا ہے، البتہ آخرت میں جہاں کا سارا انتظام فاضل حق کی بنیاد پر ہو گا اور جہاں ہر چیز اُس رازی قسم کے ترازو سے تولی جائے گی جس کے پلڑے ایمان و اخلاق کے وزن سے ٹھکیں گے اور مال و دولت کے بڑے سے بڑے انباروں کا بھی کوئی وزن نہ دکھائیں گے، زندگی کی آرائشیں اور رزق کے طہات سب محض ملک حلالوں کے لیے مخصوص ہوں گے اور وہ ملک حرام ان میں سے کچھ نہ پاسکیں گے جنہوں نے اپنے رب کے رزق پر پٹنے کے بعد اپنے رب ہی کے خلاف سرکشی کی۔

۱۵ اس کی تشریح سورہ انعام رکوع ۱۵ کے حواشی میں کی جا چکی ہے۔

۱۶ اصل میں لفظ اِثم استعمال ہوا ہے جس کے اصل معنی کوتاہی کے ہیں۔ اِثم اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تیز روی پر قادر ہو اور پھر سست چلے۔ اسی سے اس لفظ میں گناہ کا مفہوم پیدا ہوا ہے یعنی ان کا اپنے رب کا طاعت و فرما برداری میں قدرت و استطاعت کے باوجود کوتاہی کرنا اور اس کی رضا کو پہنچنے میں قصور دکھانا۔

۱۷ یعنی اپنی حد سے تجاوز کر کے ایسے حدود میں قدم رکھنا جن کے اندر داخل ہونے کا آدمی کو حق نہ ہو۔ اس تعریف کی رو سے وہ لوگ بھی باغی قرار پاتے ہیں جو بندگی کی حد سے نکل کر خدا کے ملک میں خود مختارانہ رویہ اختیار

کہ جس کے متعلق تھیں علم نہ ہو کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے۔

ہر قوم کے لیے ہدایت کی ایک مدت مقرر ہے، پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی۔ (اور یہ بات اللہ نے آغاز تخلیق ہی میں صاف فرمادی تھی کہ) اے بنی آدم! یاد رکھو، اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنارہے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویہ کی اصلاح کرے گا اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں ہے، اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی برپا کریں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو بالکل جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی سچی آیات کو جھٹلائے۔ ایسے لوگ اپنے نوشتہ تقدیر کرتے ہیں اور وہ بھی جو خدا کی خدائی میں اپنی کبرمائی کے ڈنکے بجاتے ہیں اور وہ بھی جو بندگان خدا کے حقوق پر دست درازی کرتے ہیں۔

۱۵؍ نئی حور، زندہ یا مردہ انسان یا جن یا فرشتے کے متعلق خدا نے خود کبھی نہیں کہا کہ وہ جو ہر الوہیت میں میرا شریک ہے یا میری صفات میں سے کوئی صفت رکھتا ہے یا میرے خداوندانہ اختیارات میں سے کوئی اختیار استعمال کر سکتا ہے یا ان حقوق میں سے کسی حق کا مستحق ہے جو مجھے اپنی مخلوق پر حاصل ہیں یا اس کو محض اپنے دہم دگمان سے بطور خود خدا کا شریک قرار دے لینا ان بڑے جرائم میں سے ہے جنہیں اللہ نے حرام کیا ہے۔

۱۶؍ یہ بات قرآن مجید میں ہر جگہ اُس موقع پر ارشاد فرمائی گئی ہے جہاں آدم و حوا علیہما السلام کے جنت سے اتارے جانے کا ذکر آیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ بقرہ رکوع ۴ - خطہ رکوع ۶ - لہذا یہاں بھی اس کو اسی موقع سے متعلق سمجھا جائے گا، یعنی نوع انسانی کی زندگی کا آغاز جب ہو رہا تھا اسی وقت یہ بات صاف طور پر سمجھا دی گئی تھی۔

کے مطابق اپنا حصہ پاتے رہیں گے، یہاں تک کہ وہ گھڑی آجائے گی جب ہمارے بھیجے ہوئے رشتے ان کی رو میں قبض کرنے کے لیے پہنچیں گے۔ اُس وقت وہ اُن سے پوچھیں گے کہ بتاؤ، اب کہاں ہیں تمہارے وہ معبود جن کو تم خدا کے بجائے پکارتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ سب ہم سے گم ہو گئے اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ ہم واقعی منکرِ حق تھے۔ اللہ فرمائے گا جاؤ، تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے گروہ جن و انس جا چکے ہیں۔ ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہو گا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہو گا جیسی کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب! یہ لوگ تھے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا لہذا انہیں آگ کا دوبرا عذاب دے۔ جواب میں ارشاد ہو گا ہر ایک کے لیے دو برائی عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو

۱۰ یعنی دنیا میں جتنے دن ان کی ہمت کے مقرر ہیں یہاں رہیں گے اور جس قسم کی بظاہر اچھی یا بری زندگی گذرنا ان کے نصیب میں ہے گزار لیں گے۔

۱۱ یعنی بہر حال ہر گروہ کسی کا خلف تھا کسی کا سلف بھی تھا۔ اگر ایک گروہ کے اسلاف نے اس کے لیے فکر و عمل کی گمراہیوں کا وہ نہ چھوڑا تھا تو وہ بھی اپنے اسلاف کے لیے ویسا ہی دوشہ چھوڑ گیا۔ اگر اس کے گمراہ ہونے کی کچھ ذمہ داری اس کے اسلاف پر عائد ہوتی ہے تو اس کے اسلاف کی گمراہی کا اچھا خاصا بار خود اس پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا کہ ہر ایک کے لیے دو برے عذاب ہے، ایک عذاب خود گمراہی اختیار کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو گمراہ کرنے کا ایک سزا اپنے جرائم کی اور دوسری سزا دوسروں کے لیے جرائم پیشگی کی میراث چھوڑنے کی۔

حدیث میں اسی مضمون کی توضیح یوں بیان فرمائی گئی ہے کہ من ابداً عبد حتى ضلالت لا یوھماھا اللہ ورسولہ، کان علیہ من الاثم مثل اثم من عمل بما لا ینقص ذلک من اوزارہ حدیثاً۔ یعنی جس نے کسی نئی گمراہی کا آغاز کیا جو اللہ اس کے رسول کے نزدیک ناپسندیدہ ہو، تو اس پر ان سب لوگوں کے گناہ کی ذمہ داری عائد ہوگی جنہوں نے اس کے نکالے ہوئے طریقہ پر عمل کیا نیز اس کے کہ خود ان عمل کرنے

(بقیہ ماضیہ) والوں کی اپنی ذمہ داری میں کوئی کمی ہو۔ اور کلا تقتل نفس ظلما الاکان علی ابن آدم الاول
 کذل من دمها لانه اول من سن القتل۔ یعنی دنیا میں جو ان بھی ظلم کے ساتھ قتل کیا جاتا ہے
 اس کے خون ناحق کا ایک حصہ آدم کے اس پہلے بیٹے کو پہنچتا ہے جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا، کیونکہ قتل ان کا
 راستہ سب سے پہلے اسی نے کھولا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص یا گروہ کسی غلط خیال یا غلط رویہ کی بنا ڈالتا ہے وہ مرتد
 ہی فعلی کا ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ دنیا میں جتنے انسان اس سے متاثر ہوتے ہیں، ان سب کے گناہ کی ذمہ داری کا بھی ایک
 حصہ اس کے حساب میں کھاجاتا رہتا ہے، اور جب تک اس کی اس فعلی کے اثرات چلتے رہتے ہیں اس کے حساب میں
 ان کا اندراج ہوتا رہتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنی نیکی یا بدی کا صرف اپنی ذات کی حد تک ہی ذمہ دار
 نہیں ہے بلکہ اس امر کا بھی جواب دہ ہے کہ اس کی نیکی یا بدی کے کیا اثرات دوسروں کی زندگیوں پر مرتب ہوئے۔

مثال کے طور پر ایک ذاتی کوئی عیسے جن لوگوں کی تعلیم و تربیت سے جن کی صحبت کے اثر سے جن کی بری مثالیں
 دیکھنے سے، اور جن کی ترفیحات سے اس شخص کے اندر زنا کاری کی صفت نے ظہور کیا وہ سب اس کے زنا کار بننے میں حصہ
 دار ہیں اور خود ان لوگوں نے اوپر جہاں جہاں سے بد نظری و بدینتی اور بدکاری کی میراث پائی ہے وہاں تک اس کی ذمہ داری
 پہنچتی ہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ اس اولین انسان پر پختہ ہوتا ہے جس نے سب سے پہلے نوح انسان کو خواہش نفس کی تسکین کا
 یہ غلط راستہ دکھایا۔ یہ اس زانی کے حساب کا وہ حصہ ہے جو اس کے اسلاف اور اس کے ہم عصروں سے تعلق رکھتا ہے
 پھر وہ خود بھی اپنی زنا کاری کا ذمہ دار ہے۔ اس کو بھلے اور بُرے کی جو تین ندری گئی تھی، اس میں ضمیر کی جو طاقت رکھی گئی
 تھی، اس کے اندر ضبط نفس کی جو قوت و دیوت کی گئی تھی، اس کو نیک لوگوں سے خیر و شر کا جو علم پہنچا تھا، اس کے سامنے
 اختیار کی جو مثالیں موجود تھیں، اس کو صنعتی بد علی کے بُرے نتائج سے جو واقفیت تھی، ان میں سے کسی چیز سے بھی اس نے فائدہ
 نہ اٹھایا اور اپنے آپ کو نفس کی اس اندھی خواہش کے حوالے کر دیا جو صرف اپنی تسکین چاہتی ہے خواہ وہ کسی طریقہ سے ہو
 یہ اس کے حساب کا وہ حصہ ہے جو اس کی اپنی ذات سے قطع رکھتا ہے۔ پھر یہ شخص اس بدی کو جس کا اکتساب اس نے کیا
 اور جسے خود اپنی سعی سے وہ پرورش کرتا رہا، دوسروں میں پھیلاتا مٹرجع کرتا ہے۔ کسی مرض خبیث کی چھوٹ کہیں سے لگتا

(بقیہ حاشیہ) ہے اور اسے اپنی نسل میں اور خدا جانے کن کن نسلوں میں پھیلا کر نہ معلوم کتنی زندگیوں کو خراب کر دیتا ہے۔ کہیں اپنا نطفہ چھوڑ آتا ہے اور جس بچہ کی پرورش کا بار اُسے خود اٹھانا چاہیے تھا اسے کسی اور کی کمائی کا ناجائز حصہ دار، اس کے بچوں کے حقوق میں زبردستی کا شریک، اس کی میراث میں ناحق کا حق دار بنا دیتا ہے اور اس حقیقی تلفی کا سلسلہ نہ معلوم کتنی نسلوں تک چلتا رہتا ہے۔ کسی دوشیزہ لڑکی کو بھسلا کر بد اخلاقی کی راہ پر ڈالتا ہے اور اس کے اندر وہ بری صفات ابھار دیتا ہے جو اس سے منعکس ہو کر نہ معلوم کتنے خاندانوں اور کتنی نسلوں تک پہنچتی ہیں اور کتنے گھر بگاڑ دیتی ہیں۔ اپنی اولاد، اپنے اقارب، اپنے دوستوں اور اپنی سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے سامنے اخلاق کی ایک بُری مثال پیش کرتا ہے اور نہ معلوم کتنے آدمیوں کے چال چلن خراب کرنے کا سبب بن جاتا ہے جس کے اثرات بعد کی نسلوں میں مدہائے دراز تک پھلتے رہتے ہیں۔ یہ سارا فوج و جوش شخص نے سوسائٹی میں برپا کیا انصاف چاہتا ہے کہ یہ بھی اس کے حساب میں لکھا جائے اور اس وقت تک لکھا جاتا رہے جب تک اس کی پھیلائی ہوئی خرابیوں کا سلسلہ دنیا میں چلتا رہے۔ اسی پر نیکی کو بھی قیاس کر لینا چاہیے کہ جو نیک ورثہ اپنے اسلاف سے ہم کو ملا ہے اُس کا جو اُن سب لوگوں کو پہنچنا چاہیے جو ابندائے آفرینش سے ہمارے زمانہ تک اس کے منتقل کرنے میں حصہ لیتے رہے ہیں، اور اس درجہ کو نہ کرنا سے سنبھالنے اور ترقی دینے میں جو خدمت ہم نے انجام دی ہے اس کا جو ہمیں ملنا چاہیے، اور اپنی سچی خیر کے جو نقوش و اثرات ہم دنیا میں چھوڑ جائیں انھیں بھی ہماری بھلائیوں کے حساب میں اس وقت تک برابر درج ہوتے رہنا چاہیے جب تک یہ نقوش باقی رہیں اور ان کے اثرات کا سلسلہ نفع انسانیت میں چلتا رہے۔

جنا کی یہ صورت جو قرآن پیش کر رہا ہے، ہر صاحب عقل انسان تسلیم کرے گا کہ صحیح اور مکمل انصاف اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح ہو سکتا ہے۔ اور اگر اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو ان لوگوں کی ساری غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں جنہوں نے جبرائے کے لیے اسی دنیا کی موجودہ زندگی کو کافی سمجھا ہے، یا یہ گمان کیا ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کی پوری جزا و تناسخ کی صورت میں مل سکتی ہے جیسا کہ خدا ہے کہ ان لوگوں نے نہ تو انسانی اعمال اور ان کے اثرات و نتائج کی دستوں کو سمجھا ہے اور نہ مصفاانہ جزا اور اس کے تقاضوں کو۔ ایک ہفت روزہ آج اپنی پچاس ساٹھ سال کی زندگی میں جو اچھے یا برے کام کرتا ہے ان کی ذرا سی

(بقیہ حاشیہ) میں نہ معلوم ادھر کی کتنی نسلیں شریک ہیں جو گزرتی ہیں اور آج یہ ممکن نہیں کہ انھیں اس کی جزا یا سزا پہنچ سکے۔ پھر اس شخص کے یہ اچھے یا بُرے اعمال جو وہ آج کر چکا ہے اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جائیں گے بلکہ ان کے اثرات کا سلسلہ آئندہ صد ہا برس تک چلتا رہے گا، ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں ان لوگوں تک پھیلے گا اور اس کے حساب کا کھاتہ اس وقت تک کھلا رہے گا جب تک یہ اثرات چل رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں کس طرح ممکن ہے کہ آج ہی اس دنیا کی زندگی میں اس شخص کو اس کے کسب کی پوری جزا مل جائے درآں حالے کہ ابھی اس کے کسب کے اثرات کا لاکھوں حصہ بھی رد نما نہیں ہوا ہے۔ پھر اس دنیا کی محدود زندگی اور اس کے محدود امکانات سرے سے اتنی گنجائش ہی نہیں رکھتے کہ یہاں کسی کو اس کے کسب کا پورا بدلہ مل سکے۔ آپ کسی ایسے شخص کے جرم کا تصور کیجیے جو مثلاً دنیا میں ایک جنگ عظیم کی آگ بھڑکاتا ہے اور اس کی اس حرکت کے بے شمار برے نتائج ہزاروں برس تک اربوں ان لوگوں تک پھیلتے ہیں کیا کوئی بڑی سے بڑی جہانی، اخلاقی، روحانی، یا مادی سزا بھی جو اس دنیا میں دی جانی ممکن ہے، اس کے اس جرم کی پوری منصفانہ سزا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح کیا دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انعام بھی جس کا تصور آپ کر سکتے ہیں کسی ایسے شخص کے لیے کافی ہو سکتا ہے جو مدۃ العمر نوبۃ انسانی کی بھلائی کے لیے کام کرتا رہا ہو اور ہزاروں سال تک بے شمار انسان جس کی سعی کے ثمرات سے فائدہ اٹھاتے رہے ہوں۔ عمل اور جزا کے مسئلے کو اس پہلو سے جو شخص دیکھے گا اسے یقین ہو جائے گا کہ جزا کے لیے ایک دوسری عالم درکار ہے جہاں تمام اگلی اور پچھلی نسلیں جمع ہوں، تمام ان لوگوں کے کھاتے بند ہو چکے ہوں، حساب کرنے کے لیے ایک عظیم و خیر خدا انصاف کی گمرسی پر متمکن ہو، اور اعمال کا پورا بدلہ پانے کے لیے ان ان کے پاس غیر محدود زندگی اور اس کے گرد و پیش جزا و سزا کے غیر محدود امکانات موجود ہوں۔

پھر اسی پہلو پر غور کرنے سے اہل تمنّٰی کی ایک اور بنیادی غلطی کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے جس میں مبتلا ہو کر انھوں نے آگاہوں کا چکر تھوڑا کیا ہے۔ اس حقیقت کو نہیں سمجھے کہ صرف ایک ہی مختصر سی پچاس سالہ زندگی کے کارنامے کا پھل پانے کے لیے اس سے ہزاروں گنی زیادہ طویل زندگی درکار ہے، لہذا کہ اس پچاس سالہ زندگی کے ختم ہوتے ہی ہماری ایک دوسری اور پھر تیسری ذمہ دارانہ زندگی اسی دنیا میں شروع ہو جائے اور ان زندگیوں میں بھی ہم مزید ایسے کام کرتے چلے جائیں

اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا کہ اگر ہم قابل الزام تھے تو تمہی کو ہم پر کونسی فضیلت حاصل تھی، اب اپنی کمائی کے نتیجہ میں عذاب کا مزہ چکھو۔

جن کا اچھا یا برا پھل ہیں ملنا ضروری ہو۔ اس طرح تو حساب بے باقی ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھنا ہی چلا جائے گا اور اس کے بے باقی ہونے کی نوبت کبھی آ ہی نہ سکے گی۔

سہ اہل دوزخ کی اس باہمی تکرار کو قرآن مجید میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ سبار کو ح ۴ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "کاش تم نہ دیکھ سکو اس موقع کو جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اور ایک دوسرے پر باتیں بنا رہے ہوں گے۔ جو لوگ دنیا میں کمزور بنا کر رکھے گئے تھے وہ ان لوگوں سے بڑے بن کر رہے تھے، کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ وہ بڑے بننے والے ان کمزور بنانے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روک دیا تھا جب کہ وہ تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تم خود کب ہدایت کے طالب تھے؟ اگر ہم نے تمہیں دنیا کے لالچ دے کر اپنا بندہ بنایا تو تم لالچی تھے جب ہی تو ہمارے دام میں گرفتار ہوئے۔ اگر ہم نے تمہیں خریدا تو تم خود بچکنے کے لیے تیار تھے جب ہی تو ہم خرید سکے۔ اگر ہم نے تمہیں مادہ پرستی اور دنیا پرستی اور قوم پرستی اور ایسی ہی دوسری گمراہیوں اور بد اعمالیوں میں مبتلا کیا تو تم خود خدا سے بے ترار اور دنیا کے پرستار تھے جب ہی تو تم نے خدا پرستی کی طرف بلانے والوں کو چھوڑ کر ہماری پکار پر لبیک کہا۔ اگر ہم نے تمہیں مذہبی قسم کے فریب دیے تو ان چیزوں کی مانگ تو تمہارے ہی اندر موجود تھی جنہیں ہم پیش کرتے تھے اور تم لپک لپک کریتے تھے۔ تم خدا کے بجائے ایسے حاجت ردا مانگتے تھے جو تم سے کسی اخلاقی قانون کی پابندی کا مطالبہ نہ کریں اور بس تمہارے کام بناتے رہیں۔ ہم نے وہ حاجت ردا تمہیں گھر گھر دے دیے۔ تم کو ایسے سفارشیوں کی تلاش تھی کہ تم خدا سے بے پروا ہو کر دنیا کے گتے بنے رہو اور بخشوانے کا ذمہ وہ لے لیں ہم نے وہ سفارشی تصنیف کر کے تمہیں فراہم کر دیے۔ تم چاہتے تھے کہ خشک و بے مزہ دینداری اور پرہیزگاری اور قربانی اور سعی و عمل کے بجائے نجات کا کوئی اور راستہ بتایا جائے جس میں نفس کے لیے لذتیں ہی لذتیں ہوں اور خواہشات پر پابندی کوئی نہ ہو۔ ہم نے ایسے خوش نامذہب تمہارے لیے ایجاد کر دیے۔ غرض یہ کہ ذمہ داری تنہا ہمارے ہی اوپر نہیں ہے۔ تم

یقین جانو! جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی کی ہے ان کے لیے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے۔ اُن کا جنت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سونے کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا۔ جو مومن کو ہمارے ہاں ایسا ہی بدلہ ملا کرتا ہے۔ ان کے لیے تو جہنم کا پھوٹا ہوگا اور جہنم ہی کا اوڑھنا۔ یہ ہے وہ جزا جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا ہے اور اچھے کام کیے ہیں۔ اور اس باب میں ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ وہ اہل جنت ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے۔ اُن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے کہ تعریف خدا ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا۔ ہم خود راہ نہ پاسکتے تھے اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا۔ ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول حق نے کر آئے تھے۔ اُس وقت بد

بھی برابر کے ذمہ دار ہو۔ ہم اگر گمراہی فراہم کرنے والے تھے تو تم اس کے خریدار تھے۔

۱۰ یعنی دنیا کی زندگی میں ان نیک لوگوں کے درمیان اگر کچھ رنجشیں، بدفرگیاں اور آپس کی غلط فہمیاں رہی ہوں تو آخرت میں وہ سب دور کر دی جائیں گی، ان کے دل ایک دوسرے سے صاف ہو جائیں گے اور وہ مخلص دستانوں کی حیثیت سے جنت میں داخل ہوں گے۔ کسی کو یہ دیکھ کر تعجب نہ ہوگی کہ ظالم جو میرا مخالف تھا اور فلاں جو مجھ سے لڑا تھا اور فلاں جس نے مجھ پر تنقید کی تھی، آج وہ بھی اس ضیافت میں میرے ساتھ شریک ہے۔ اسی آیت کو پڑھ کر حضرت علی نے فرمایا تھا کہ مجھے امید ہے اللہ میرے اور عثمان اور طلحہ اور زبیر کے درمیان بھی صفائی کر دے گا۔

اس آیت کو اگر ہم زیادہ وسیع نظر سے دیکھیں تو یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ صلح اہل فوں کے دامن پر اس دنیا کی زندگی میں جو داغ لگ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان داغوں سمیت انہیں جنت میں نہ لے جائے گا بلکہ وہاں داخل کرنے سے پہلے اپنے فضل سے انہیں بالکل پاک صاف کر دے گا اور وہ پے داغ زندگی لیے جئے وہاں جائیں گے۔

آئے گی کہ یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو تمہیں اُن اعمال کے بدلے میں ملی ہے جو تم کرتے رہے تھے۔

پھر جنت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے، ہم نے اُن سارے وعدوں کو ٹھیک

سنا یہ ایک نہایت لطیف معاملہ ہے جو وہاں پیش آئے گا۔ اہل جنت اس بات پر نہ پھولیں گے کہ ہم نے کام ہی ایسے کیے تھے جن پر ہمیں جنت ملنی چاہیے تھی بلکہ وہ خدا کی حمد و ثنا اور شکر و احسانندی میں رطب اللسان ہوں گے اور کہیں گے کہ یہ سب ہمارے رب کا فضل ہے درز ہم کس لائق تھے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ ان پر اپنا احسان نہ جتائے گا بلکہ جواب میں ارشاد فرمائے گا تو یہ کہ تم نے یہ درجہ اپنی خدمات کے صلہ میں پایا ہے، یہ تمہاری اپنی محنت کی کمائی ہے جو تمہیں دی جا رہی ہے، یہ بھیک کے ٹکڑے نہیں ہیں بلکہ تمہاری سعی کا اجر ہے، تمہارے کام کی مزدوری ہے، اور وہ باعزت روزی ہے جس کا استحقاق تم نے اپنی قوت بازو سے اپنے لیے حاصل کیا ہے۔ پھر یہ مضمون اس انداز بیان سے اور بھی زیادہ لطیف ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جواب کا ذکر اس تصریح کے ساتھ نہیں فرماتا کہ ہم یوں کہیں گے، بلکہ اتہائی شان کریم کے ساتھ فرماتا ہے کہ جواب میں یہ ندا آئے گی۔

درحقیقت یہی معاملہ دنیا میں بھی خدا اور اس کے نیک بندوں کے درمیان ہے۔ ظالموں کو جو نعمت دینا میں ہوتی ہے وہ اس پر فخر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ ہماری قابلیت اور سعی و کوشش کا نتیجہ ہے، اور اسی بنا پر وہ ہر نعمت کے حصول پر اور زیادہ حکم اور مفسد بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس صالحین کو جو نعمت بھی ملتی ہے وہ اسے خدا کا فضل سمجھتے ہیں، شکر بجا لاتے ہیں، جتنے نوازے جاتے ہیں اتنے ہی زیادہ متواضع اور رحیم و شفیق اور فیاض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر آخرت کے بارے میں بھی وہ اپنے حسن عمل پر غور نہیں کرتے کہ ہم تو ضرور نیک ہی جائیں گے بلکہ اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرتے ہیں، اپنے عمل کے بجائے خدا کے رحم اور فضل سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں اور ہمیشہ ڈرتے ہی رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے حساب میں لینے کے بجائے کچھ دینا کا نہ نکل آئے۔ بخاری و مسلم دونوں میں یہ روایت موجود ہے کہ حضور نے فرمایا اعلیٰوا ان احدکم لن یدخلہ عملہ الجنۃ۔ خوب جان لو کہ تم محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں نہ پہنچ جاؤ گے۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا

پایا جو ہمارے رب نے ہم سے کیے تھے، کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کیے تھے؟ وہ جواب دیں گے ہاں۔ تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ خدا کی لعنت ان ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور آخرت کے منکر تھے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ داخل ہوگی جس کی بند یوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے۔ یہ جنت میں داخل تو نہیں ہوئے مگر اس کے امیدوار ہیں۔ یہ ہر ایک کو اس کے قیادہ سر پہنچائیں گے۔ جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ "سلامتی ہو تم پر"۔ اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے، اے رب! ہمیں ان ظالم لوگوں میں نہ شامل کیجیو، پھر یہ اعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاروں گے کہ "دیکھ لیا تم نے، آج نہ تمہارے جتنے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز و سامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے۔ اور کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمتوں سے کچھ بھی نہ دے گا؟ آج انہی سے کہا گیا کہ داخل ہو جنت میں، تمہارے لیے نہ خوف ہے نہ رنج۔"

اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہم ٹپلا دیا جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اسی میں سے کچھ پھینک دو۔ وہ جواب دیں گے کہ "اللہ نے یہ دونوں چیزیں ان منکرین حق پر حرام کر دی ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنالیا تھا اور جنہیں دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اللہ فرماتا ہے کہ آج ہم بھی انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح وہ اس دن کی ملاقات کو بھولے

آپ بھی؟ فرمایا ہاں میں بھی، الا ان یتغمدا فی اللہ برحمۃ منہ وفضلہ، الایہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت اور اپنے فضل سے ڈرنا سکے۔

یعنی یہ اصحاب الاعراف وہ لوگ ہوں گے جن کی زندگی کا نہ تو مثبت پہلو ہی اتنا قوی ہوگا کہ جنت میں داخل ہو سکیں اور نہ منفی پہلو ہی اتنا خراب ہوگا کہ دوزخ میں جھونک دیے جائیں۔ اس لیے وہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک سرحد پر ایسے گئے۔

رہے اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے۔

ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر فضل بنایا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ اب کیا یہ اس کے سوا کسی اور بات کے منتظر ہیں کہ وہ

۱۰ اہل جنت اور اہل دوزخ اور اصحاب الاحواف کی اس گفتگو سے کسی حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عالم آخرت میں انسان کی تہیں ان حدود کے ساتھ محدود نہ ہوں گی جو یہاں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ ان کا پیمانہ اس عالم سے بہت زیادہ وسیع ہوگا۔ وہاں آنکھوں کی بنیائی اتنے بڑے پیمانہ پر ہوگی کہ جنت اور دوزخ اور احواف کے لوگ جب چاہیں گے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے، اور اسی طرح وہاں آواز اور سماعت بھی اتنے بڑے پیمانہ پر ہوگی کہ ان مختلف دنیاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے باسانی گفت و شنید کر سکیں گے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے بیانات جو عالم آخرت کے متعلق ہیں قرآن میں ملتے ہیں، اس بات کا تصور دلانے کے لیے کافی ہیں کہ وہاں زندگی کے قوانین ہماری موجودہ دنیا کے قوانین طبعی سے بالکل مختلف ہوں گے اگرچہ ہماری شخصیتیں بھی رہیں گی جو یہاں ہیں جن لوگوں کے دماغ اس عالم طبعی کے حدود میں اس قدر مقید ہیں کہ موجودہ زندگی اور اس کے مختصر پیمانوں سے وسیع تر کسی چیز کا تصور ان میں نہیں سما سکتا وہ قرآن اور حدیث کے ان بیانات کو بڑے اچھے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور با اوقات ان کا مذاق اڑا کر اپنی خفیف العقلی کا مزید ثبوت بھی دینے لگتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان بچاوروں کا دماغ جتنا تنگ ہے زندگی کے امکانات اتنے تنگ نہیں ہیں۔

۱۱ یعنی اس میں پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور انسان کے لیے دنیا کی زندگی میں کون سا رویہ درست ہے اور صحیح طرز زندگی کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ پھر یہ تفصیلات بھی قیاس و گمان یا دہم کی بنیاد پر نہیں بلکہ خالص علم کی بنیاد پر ہیں۔

۱۲ مطلب یہ ہے کہ اول تو اس کتاب کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہی بجائے خود اس قدر صاف ہیں کہ آدمی اگر ان پر غور کرے تو اس کے سامنے راہ حق واضح ہو سکتی ہے۔ پھر اس پر مزید یہ ہے کہ جو لوگ اس کتاب کو ماننے میں ان کی زندگی میں عملاً بھی اس حقیقت کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ بیان ان کی کیسی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس کا اثر

انجام سامنے آجائے جس کی یہ خیر دے رہی ہے جس روز وہ انجام سامنے آگیا تو وہی لوگ جنہوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا کہیں گے کڑواقی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے، پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے تصنیف کر رکھے تھے آج ان سے گم ہو گئے۔

درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر اپنے تخت

قبول کرنے ہی انسان کی ذہنیت، اس کے اخلاق اور اس کی سیرت میں بہترین انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔

سہ دوسرے الفاظ میں اس مضمون کو یوں سمجھ لیں کہ جس شخص کو صحیح اور غلط کا فرق نہایت معقول طریقہ سے صاف صاف بتایا جاتا ہے مگر وہ نہیں مانتا، پھر اس کے سامنے کچھ لوگ صحیح راستہ پر چل کر شاہدہ بھی کر دیتے ہیں کہ غلط روی کے زمانے میں وہ جیسے کچھ تھے اس کی نسبت راست روی اختیار کر کے ان کی زندگی کتنی بہتر ہو گئی ہے، مگر اس سے بھی وہ کوئی سبق نہیں لیتا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ صرف اپنی غلط روی کی سزایا کر ہی مانتے گا کہ ہاں یہ غلط روی تھی، جو شخص حکیم کے یا قلائد مشوروں کو قبول کرتا ہے اور نہ اپنے جیسے بکثرت بیماروں کو حکیم کی ہدایات پر عمل کرنے کی وجہ سے شفا یاب ہوتے دیکھ کر ہی کوئی سبق لیتا ہے، وہ اب بستر مرگ پر لیٹ جانے کے بعد ہی تسلیم کرے گا کہ جن طریقوں پر وہ زندگی بسر کر رہا تھا وہ اس کے لیے واقعی جہلک تھے۔

سہ یعنی وہ دوبارہ اس دنیا میں واپس آنے کی خواہش کریں گے اور کہیں گے کہ جس حقیقت کی ہمیں خبر دی گئی تھی اور اُس وقت ہم نے نہ مانا تھا، اب شاہدہ کر لینے کے بعد ہم اس سے واقف ہو گئے ہیں، لہذا اب اگر ہمیں دنیا میں پھر بھیج دیا جائے تو ہمارا طرز عمل وہ نہ ہوگا جو پہلے تھا۔

سہ یہاں دن کا لفظ دور (Period) کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورہ حج رکوع ۶ میں فرمایا: رَانَ يَوْمًا عَمَدًا سَرِيًّا كَأَنَّهُ سَنَتُهُمَا تَعُدُّوْنَ (اور حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کے ہاں ایک دن ہزار سال

سلطنت پر ممکن ہوا۔ جرات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے چمکے دوڑا جلا آتا ہے جس نے
کے برابر ہے اس حساب سے جو تم لوگ لگاتے ہو، اور سورہ معارج کی ابتدائی آیات میں فرمایا کہ قَعْرُوبُ الْمَلَأَتْ كُتُبًا وَالرُّجُومُ
الَّتِي فِي يَوْمٍ كَانَ مَقْدَرُ الْأَرْحَامِ حَمْسِينَ أَلْفًا سَنَةً (ترجمتے اور جبریل اس کی طرف ایک دن میں چڑھتے ہیں
جس کی مقدار ۵۰ ہزار سال کی ہے)

۱۔ خدا کے استوار علی الوش (تخت سلطنت پر متمکن ہونے) کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔
بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کے بعد کسی مقام کو اپنی اس لامحدود سلطنت کا مرکز قرار دے کر اپنی تجلیات کو وہاں
مرکز قرار دیا ہو اور اسی کا نام عرش ہو جہاں سے سارے عالم پر وجود اور قوت کا فیضان بھی ہو رہا ہے اور تدبیر امر بھی فرمائی جا رہی
ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرش سے مراد اقتدار فرماں روائی ہو اور اس پر متمکن ہو جانے سے مراد یہ ہو کہ اللہ نے کائنات کو پیدا
کر کے اس کی تمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ بہر حال استوار علی الوش کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو، قرآن میں اس کے ذکر
کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبر کائنات بھی ہے۔ وہ دنیا کو
وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر بیٹھ نہیں گیا ہے بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جزو کل پر فرماں روائی کر رہا ہے،
سلطانی و حکمرانی کے تمام اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں، ہر چیز اس کے امر کی تابع ہے، ذرہ ذرہ اس کے فرمان کا
مطیع ہے اور موجودات کی قسمیں داتا اس کے حکم سے وابستہ ہیں۔ اس طرح قرآن اس بنیادی غلط فہمی کی جڑ کاٹنا چاہتا ہے
جس کی وجہ سے انسان کھنچی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہوا ہے اور کبھی خود مختاری و خود سری کی فطرت میں۔ خدا کو کائنات کے
انتظام سے عملاً بے تعلق سمجھ لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی قسمت کو خود مختار دہشتہ بچے اور ان کے تگے سر جھکاوے یا پھر اپنی قسمت کا
مالک خود اپنے آپ کو سمجھے اور خود مختار بن بیٹھے۔
یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے۔ قرآن مجید میں خدا اور خلق کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے انسانی زبان میں سے

زیادہ تر وہ الفاظ، مصطلحات، استعارے اور انداز بیان انتخاب کیے گئے ہیں جو سلطنت و پادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ
طرز بیان قرآن میں اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی شخص جو سمجھ کر دران نو پڑھتا ہو اسے محسوس ہو کہ یہ نہیں رہ سکتا۔ بعض کم فہم
ناقدین کے محسوس دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ کتاب جس عہد کی تصنیف ہے اس زمانہ میں انسان کے ذہن

سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے، سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خیر دار ہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ، سامنے جہانوں کا مالک و پروردگار۔ اپنے رب کو پکارو گرو گرو!

پرتشاہی نظام کا تسط تھا اس لیے مصنف نے (جس سے مراد ان ظالموں کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) خدا کو بادشاہ کے رنگ میں پیش کیا۔ حالانکہ دراصل قرآن جس دائمی وابدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے وہ اس کے برعکس یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں بادشاہی صرف ایک ذات کی ہے، اور حاکمیت (Sovereignty) جس شے کا نام ہے وہ اسی ذات کے لیے خاص ہے، اور یہ نظام کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے جس میں تمام خدائات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے، لہذا اس نظام میں جو شخص یا گروہ اپنی یا کسی اور کی جزوی یا کلی حاکمیت کا مدعی ہے وہ محض فریب میں مبتلا ہے۔ نیز یہ کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے انسان کے لیے اس کے ہوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسی ایک ذات کو مذہبی معنوں میں واحد معبود بھی مانے اور سیاسی و تمدنی معنوں میں واحد سلطان (Sovereign) بھی تسلیم کرے۔

اسی مضمون کی مزید تشریح ہے جو استوار علی العرش کے الفاظ میں بھلا بیان کیا گیا تھا یعنی یہ کہ خدا محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے۔ اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس میں حکم چلائیں اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصے کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح چاہے خود کام کرے، بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس وہاں رہی گردش آپ سے آپ نہیں ہو رہی ہے بلکہ خدا کے حکم سے ہو رہی ہے، جب چاہے وہ اسے روک دے اور جب چاہے اس کے نظام کو تبدیل کر دے۔ سورج اور چاند اور تارے خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں بالکل سنبھلے ہیں اور مجبور غلاموں کی طرح بس وہی کام کیے جا رہے ہیں جو خدا ان سے لے رہا ہے۔

اللہ برکت کے اصل معنی ہیں نوا، افزائش اور بڑھوتری کے، اور اسی کے ساتھ اس لفظ میں رفعت و عظمت کا مفہوم بھی ہے اور ثبات اور جفاؤ کا بھی۔ پھر ان سب مفہومات کے ساتھ خیر اور بھلائی کا تصور لازماً شامل ہے پس اللہ کے

ہوے اور چپکے چپکے، یقیناً وہ زندگی سیکھنے والوں کو بند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد پر پانہ کر جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور نہایت بابرکت ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی خوبیوں اور بھلائیوں کی کوئی حد نہیں ہے، بے حد حساب خیرات اس کی ذات سے پھیل رہی ہیں، اور وہ بہت بلند و برتر ہستی ہے، کہیں جا کر اس کی بلندی ختم نہیں ہوتی، اور اس کی یہ بھلائی اور رفعت متناہی ہے، ماضی نہیں ہے کہ کبھی اس کو زوال ہو۔

لے زمین میں فساد برپا نہ کر دے، یعنی زمین کے انتظام کو خراب نہ کر دے۔ انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت اور تمدن کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے میوا کسی اور کی رہنمائی سے مانع ہو، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی پیشاب صورتیں رونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنے کا قرآن کا مقصد ہے۔ پھر اس کے ساتھ قرآن اس حقیقت پر بھی متنبہ کرتا ہے کہ زمین کے انتظام میں اصل چیز فساد نہیں ہے جس پر اصلاح عارض ہوتی ہو بلکہ اصل چیز صلاح ہے جس پر فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی سے عارض ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہاں انسان کی زندگی کی ابتدا جہالت و وحشت اور شرک و بغاوت اور اخلاقی بد نظمی سے نہیں ہوتی ہے جس کو دور کرنے کے لیے بعد میں تدریج اصلاحات کی گئی ہوں، بلکہ فی حقیقت انسانی زندگی کا آغاز صلاح سے ہوا ہے اور بعد میں اس درست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے خراب کرتے رہے ہیں اور اسے از سر نو درست کر دینے کے لیے جو پیغمبر وقتاً فوقتاً خدا نے بھیجے ہیں انہوں نے ہر زمانے میں انسان کو یہی دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس صلاح پر قائم کیا گیا تھا اس میں فساد برپا کرنے سے باز آؤ۔

اس معاملہ میں قرآن کا نقطہ نظر ان لوگوں کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے جنہوں نے ارتقار کا ایک غلط تصور کر لیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر تدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بنی اور ختمی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر ربیعاً اور ایک صالح نظام سے اس کی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ پھر انسان خود شیطان کی رہنمائی قبول کر کے بار بار تاریکی میں مبتلا ہوا

خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ، یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔
 اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری لیے ہومے بھیجتا ہے، پھر
 جب وہ بانی سے لڑے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور
 وہاں مینہ برسا کر (اُسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو، اس طرح ہم مرنے
 کو حالت موت سے نکالتے ہیں، شاید کہ تم اس شاہدے سے سبق لو۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے
 رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا
 کچھ نہیں نکلتا۔ اس طرح ہم نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو شکر گزار ہونے
 اور اس صالح نظام کو بگاڑتا رہا اور خدا بار بار اپنے پیغمبروں کو اس غرض کے لیے بھیجتا رہا کہ اسے تاریکی سے روشنی
 کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے کی دعوت دیں۔

لہٰذا اس فقرے سے واضح ہو گیا کہ اوپر کے فقرے میں جس چیز کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے وہ دراصل یہی ہے کہ انسان خدا
 کے بجائے کسی اور کو اپنا وحی سرپرست اور کار ساز و کار فرما کر اللہ کے کردار کے لیے بکا رہے۔ اور اصلاح اس کے سوا کسی
 دوسری چیز کا نام نہیں ہے کہ انسان کی اس بکار کا مزاج پھر سے محض اللہ کی ذات ہی ہو جائے۔
 خوف اور طمع کے ساتھ پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں خوف بھی ہو تو اللہ سے ہو اور تمہاری امیدیں بھی اگر کسی
 سے وابستہ ہوں تو صرف اللہ سے ہوں۔ اللہ کو پکارو تو اس حساس کے ساتھ پکارو کہ تمہاری قیمت بالکل اس کی نظر
 عنایت پر منحصر ہے، فلاح و سعادت کو پہنچ سکتے ہو تو صرف اس کی مدد اور رہنمائی سے اور نہ جہاں تم اس کی اعانت سے
 محروم ہوئے پھر تمہارے لیے تباہی و نامرادی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں ہے۔

لہٰذا یہاں ایک لطیف مضمون ارشاد ہوا ہے جس پر متنبہ ہو جانا اصل مدعا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ بارش
 اور اس کی برکتوں کے ذکر سے اس مقام پر خدا کی قدرت کا بیان یا حیات بعد الممات کا اثبات مقصود نہیں ہے بلکہ اصل
 یہاں تمثیل کے پیرایہ میں رسالت اور اس کی برکتوں کا اور اس کے ذریعہ سے خوف زشت میں فرق اور خبیث لطیف

دلے ہیں۔

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو،

میں امتیاز نمایاں ہو جانے کا نقشہ پیش کرنا مقصود ہے۔ رسول کی آمد اور خدائی تعلیم و ہدایت کے نزول کو بارانی ہواؤں کے چلنے اور ابر رحمت کے چھا جانے اور امت بھری بوندوں کے برسنے سے تشبیہ کی گئی ہے۔ پھر بارش کے ذریعہ سے مردہ پڑی ہوئی زمین کے یکایک جی اٹھنے اور اس کے لپٹن سے زندگی کے خزانے ابل پڑنے کو اس حالت کے لیے بطور مثال پیش کیا گیا ہے جو نبی کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی سے مردہ پڑی ہوئی انسانیت کے یکایک جاگ اٹھنے اور اس کے سینہ سے بھلائیوں کے خزانے ابل پڑنے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح بارش کے نزول سے یہ ساری برکتیں صرف اسی زمین کو حاصل ہوتی ہیں جو حقیقت میں زرخیز ہوتی ہے اور محض پانی نہ بہنے کی وجہ سے جس کی صلاحیتیں دبی رہتی ہیں، اسی طرح رسالت کی ان برکتوں سے بھی صرف وہی ان فائدہ اٹھانے میں جو حقیقت میں صالح ہوتے ہیں اور جن کی صلاحیتوں کو محض رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے نمایاں ہونے اور برسر کار آنے کا موقع نہیں ملتا۔ وہی شہادت پسند اور خبیث انسان کو جس طرح شوریلی زمین باران رحمت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ پانی پڑتے ہی اپنے پیٹ کے چھپے ہوئے زہر کو کانٹوں اور جھاڑیوں کی صورت میں اگل دیتی ہے، اسی طرح رسالت کے ظہور سے انھیں بھی کوئی نفع نہیں پہنچتا بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر دبی ہوئی تمام خبیثیتیں ابھر کر پوری طرح برسر کار آ جاتی ہیں۔

اسی تمثیل کو بعد کے کئی رکوعوں میں سلسل تاریخی شواہد پیش کر کے واضح کیا گیا ہے کہ ہر زمانے میں نبی کی بعثت کے بعد انسانیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طیب حصہ جو فیض رسالت سے پھلا اور پھولا اور بہتر برگ و بار لایا اور دوسرا خبیث حصہ جس نے کسوٹی کے سامنے آتے ہی اپنی ساری کھوٹ نمایاں کر کے رکھ دی اور آخر کار اس کو ٹھیک اسی طرح چھانٹ کر پھینک دیا گیا جس طرح شہناہ چاندی سونے کے کھوٹ کو چھانٹ پھینکتا ہے۔

لہٰذا ہنری رینچی مان کی ابتدا حضرت نوح اور ان کی قوم سے کی گئی ہے کیونکہ قرآن کی رو سے جس صالح نظام زندگی

اُس کے سوا تمھارا کوئی اللہ نہیں ہے۔ میں تمھارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔
 حضرت آدم اپنی اولاد کو چھوڑ گئے تھے اُس میں سب سے پہلا بکارا حضرت نوح کے دور میں رونما ہوا اور اس کی اصلاح
 کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور فرمایا۔

قرآن کے اشارات اور تواتر کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوح کی قوم اُس سرزمین میں
 رہتی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔ بابل کے آثار قدیمہ میں تورات سے قدیم تر جو کتبات بنے ہیں اُن
 سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اُن میں تقریباً اُسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات میں بیان ہوا
 ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح میں بتائی گئی ہے۔ پھر جو روایات کردستان اور آرمینیا میں قدیم ترین زمانہ
 سے نسل بعد نسل چلی آ رہی ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر
 ٹھہری تھی۔ موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے آس پاس اور آرمینیا کی سرحد پر کوہ اماراط کے نواح میں نوح علیہ السلام
 کے مختلف آثار کی نشان دہی کی جاتی ہے اور شہر نخبوان کے باشندوں میں آج تک شہود ہے کہ اس شہر کی بنا حضرت نوح
 نے ڈالی تھی۔

حضرت نوح کے اس قصے سے جتنی روایات یونان، مصر، ہندستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں اور اس کے
 علاوہ براہ، اٹلیا، جزائر شرقیہ، آسٹریلیا، نیوگنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانہ سے
 چلی آ رہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس جہدے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسل آدم کسی ایک ہی خطہ زمین میں رہتی
 تھی اور پھر وہاں سے دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک جہدے گیر طوفان کی نشان
 دہی کرتی ہیں اگرچہ مردار یا م سے اس کی حقیقی تفصیلات انھوں نے فراموش کر دیں اور اصل واقعہ پر ہر ایک نے اپنے اپنے
 تخیل کے مطابق اف نون کا ایک بھاری خول چڑھا دیا۔

ملہ یہاں اور دوسرے مقامات پر حضرت نوح اور ان کی قوم کا جو حال قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ
 بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو خدا کے وجود کی منکر تھی نہ خدا سے ناواقف تھی نہ اسے خدا کی عبادت سے

اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا "ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔" نوح نے کہا "اے برادران قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے؟" مگر انھوں نے اس کو جھٹلادیا۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے

انکار تھا۔ بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہو گئی تھی، شرک کی گمراہی تھی، یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو الوہیت میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصہ دار قرار دے دیا تھا۔ پھر اس بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں رونما ہو گئیں۔ جو خود ساختہ معبود خدائی میں شریک ٹھہرایے گئے تھے ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا جو تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا اور اس نے ان لوگوں میں اورنج اور نیچ کی تقسیم پیدا کر دی، اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فتنے و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھکھلی کر دیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس حالت کو بدھنے کے لیے ایک زمانہ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ گوشہ نشینی کی مگر عامۃ الناس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھانس رکھا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ آخر کار حضرت نوح نے خدا سے دعا کی کہ ان کافروں میں سے ایک کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ، کیونکہ اگر ان میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو تیرے بندوں کو گمراہ کر دے گا اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا بدکار اور نمک حرام ہی پیدا ہو گا۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ہود رکوع ۲ - سورہ شعراء رکوع ۶ - اور سورہ نوح مکتل)

۱۔ معاملہ حضرت نوح اور ان کی قوم کے درمیان پیش آیا تھا بعینہ ایسا ہی معاملہ مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے درمیان بھی پیش آ رہا تھا۔ جو پیغام حضرت نوح کا تھا وہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ جو شبہات اہل مکہ کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں ظاہر کرتے تھے، وہی شبہات ہنراؤں

ساتھیوں کو ایک شے میں نجات دی اور ان لوگوں کو ڈبو دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔
 سال پہلے سرداران قوم نے حضرت نوح کی رسالت میں ظاہر کیے تھے۔ پھر ان کے جواب میں جو باتیں حضرت نوح
 کہتے تھے بعینہ وہی باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے تھے۔ آگے چل کر دوسرے انبیاء علیہم السلام ان کی قوموں کے
 جو قصے مسلسل بیان ہو رہے ہیں ان میں بھی یہی دکھایا گیا ہے کہ برائی کی قوم کا رویہ اہل مکہ کے رویہ سے اور برائی کی تقریر
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے جو بہوشاہ ہے۔ اس سے قرآن اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ جس طرح گمراہی کی نوعیت ہر زمانے
 میں بنیادی طور پر ایک رہی ہے، اور جس طرح خدا کے پیچھے ہوئے علموں کی دعوت ہر عہد اور ہر سرزمین میں یکساں رہی
 ہے، لہذا اسی طرح یقین رکھو کہ انبیاء کی دعوت سے منہ موڑنے اور گمراہی پر اصرار کیے چلے جانے کا جو انجام پہلے
 ہوتا رہا ہے، خدا کی اہل سنت کے مطابق اس کا وہی انجام آج بھی ہوگا۔

جو لوگ قرآن کے انداز بیان سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے وہ بسا اوقات اس شبہ میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید
 یہ سارا معاملہ بس ایک دو مہمتوں میں ختم ہو گیا ہوگا۔ نبی اٹھا اور اس نے اپنا دعویٰ پیش کیا، لوگوں نے اعتراضات کیے
 اور نبی نے ان کا جواب دیا، لوگوں نے جھٹلایا اور اللہ نے عذاب بھیج دیا۔ حالانکہ فی الحقیقت جن واقعات کو یہاں کہیں
 چند سطروں میں بیان کر دیا گیا ہے وہ ایک نہایت طویل مدت میں پیش آئے تھے۔ قرآن کا یہ مخصوص طرز بیان ہے کہ وہ
 قصہ گوئی محض قصہ گوئی کی خاطر نہیں کرتا بلکہ سبق آموزی کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے ہر جگہ تاریخی واقعات کے بیان میں وہ
 قصے کے صرف ان اہم اجزاء کو پیش کرتا ہے جو اس کے مقصد و دعا سے کوئی تعلق رکھتے ہیں، باقی تمام تفصیلات کو نظر انداز
 کر دیتا ہے۔ پھر اگر کسی قصہ کو مختلف مواقع پر مختلف اغراض کے لیے بیان کرتا ہے تو ہر جگہ مقصد کی مناسبت سے تفصیلات
 بھی مختلف طور پر پیش کرتا ہے۔ مثلاً اسی قصہ نوح کو لیجیے۔ یہاں اس کے بیان کا مقصد پیغمبر کی دعوت کو جھٹلانے کے
 انجام سے آگاہ کرنا ہے لہذا اس مقام پر یہ ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ پیغمبر کتنی طویل مدت تک اپنی قوم کو دعوت
 دیتا رہا۔ لیکن جہاں یہ قصہ اس غرض کے لیے بیان ہوا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو صبر کی تلقین کی جائے
 وہاں خاص طور پر دعوت نوح علیہ السلام کی طویل مدت کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ ان حضرات اور آپ کے رفقاء اپنی چند سال

(بقیہ حاشیہ) کی تبلیغی سعی و محنت کو تبصرہ خیر نہ پا کر بد دل نہ ہوں اور حضرت نوح کے صبر کو دیکھیں جنہوں نے مدتہائے دراز تک نہایت دل شکن حالات میں دعوت حق کی خدمت انجام دی اور خدا بہت نہاری۔

اس موقع پر ایک اور تنگ بھی لوگوں کے دلوں میں کھٹکتا ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے۔ جب ایک شخص قرآن میں بار بار ایسے واقعات پڑھتا ہے کہ خدا کا قوم نے نبی کو جھٹلایا اور نبی نے اسے عذاب کی خبر دی اور چنانچہ اس پر عذاب آیا اور قوم تباہ ہو گئی تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس قسم کے واقعات اب کیوں نہیں پیش آتے اگرچہ قومیں گرتی بھی ہیں اور ابھرتی بھی ہیں، لیکن اس عروج و زوال کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ یہ تو نہیں ہوتا کہ ایک نوٹس کے بعد زلزلہ یا طوفان یا صاعقہ آئے اور قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھ دے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فی الحقیقت اخلاقی اور قانونی اعتبار سے اس قوم کا معاملہ جو کسی نبی کی براہ راست مخاطب ہو، دوسری تمام قوموں کے معاملات سے بالکل مختلف ہے جس قوم میں نبی پیدا ہوا ہو اور وہ بلا واسطہ اس کو خود اسی کی زبان میں خدا کا پیغام پہنچائے اور اپنی شخصیت کے اندر اپنی صداقت کا زندہ نمونہ اس کے سامنے پیش کرے، اس پر خدا کی محبت پوری ہو جاتی ہے، اس کے لیے معذرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور خدا کے فرستادہ کو دوبارہ جھٹلا دینے کے بعد وہ اس کی سختی ہو جاتی ہے کہ اس کا فیصلہ برسرِ موقع چکا دیا جائے۔ یہ نوعیت معاملہ ان قوموں سے بنیادی طور پر مختلف ہے جن کے پاس خدا کا پیغام براہ راست نہ آیا ہو بلکہ کسی مومن قوم کے واسطے سے پہنچا ہو۔ پس اگر اب اس طرح کے واقعات پیش نہیں آتے جیسے انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں پیش آئے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ البتہ تعجب کے قابل کوئی بات ہو سکتی تھی تو یہ کہ اب بھی کسی قوم پر اسی شان کا عذاب آتا جیسا انبیاء کو دو بار جھٹلانے والی قوموں پر آتا تھا۔

مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ اب خدا سے برگشتہ اور فکری و اخلاقی گمراہیوں میں سرگشتہ قوموں پر عذاب آئے بند ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی ایسی تمام قوموں پر عذاب آتے رہتے ہیں، اچھوٹے چھوٹے مقلد بھی اور بڑے بڑے فیصلہ کن مذاہب بھی، لیکن کوئی نہیں جو انبیاء علیہم السلام اور کتب آسمانی کی طرح ان عذابوں کے اخلاقی معنی

یقیناً وہ اندھے لوگ تھے۔

اور عادی کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الہ نہیں ہے، پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟" اس کی قوم کے سرداروں نے جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے، جواب میں کہا "ہم تو تمہیں

کی طرف انسان کو توجہ دلائے، بلکہ اس کے برعکس ظاہر میں سائنس دانوں اور حقیقت سے ناواقف مومنین و فلاسفہ کا ایک کثیر گروہ نوح انسانی پر مسلط ہے جو اس قسم کے تمام واقعات کی توجیہ طبیعیاتی قوانین یا تاریخی اسباب سے کر کے اس کو بھلا دے میں ڈالتا رہتا ہے اور اسے کبھی یہ سمجھنے کا موقع نہیں دیتا کہ ادھر کوئی خدا بھی موجود ہے جو غلط کار قوموں کو پہلے مختلف طریقوں سے ان کی غلط کاری پر تنبیہ کرتا ہے اور جب وہ اس کی سمجھی ہوئی تنبیہات کو آنکھیں بند کر کے اپنی غلط روی برسرِ ابر کیسے چلی جاتی ہیں تو آخر کار انھیں تباہی کے گردے میں پھینک دیتا ہے۔

۱۱۔ یہ عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے افسانے اہل عرب میں زبان زد عام تھے۔ بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ ان کی شوکت و شہرت فریادِ اشل تھی اور پھر دنیا سے ان کا نام و نشان تک مٹ جانا بھی ضربِ اشل ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی شہرت کی وجہ سے عربی زبان میں ہر ہمیم چیز کے لیے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے، آثارِ قدیمہ کو عادیات کہتے ہیں، جس زمین کے مالک باقی نہ رہے ہوں اور آباد کار نہ ہونے کی وجہ سے اُفتادہ پڑی ہوئی ہو اسے عادی اُفتادہ کہا جاتا ہے۔ قدیم عربی شاعری میں اس قوم کا ذکر کثرت ملتا ہے اور عرب کے ماہرینِ انساب اپنے ملک کی مصدوم خدو قوموں میں سب سے پہلے اسی قوم کا نام لیتے ہیں۔

قرآن کی رو سے اس قوم کا اصل مسکن احناف کا علاقہ تھا جو حجاز میں اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔ یہیں سے پھیل کر ان لوگوں نے یمن کے مغربی سواحل سے لے کر عراق تک اپنی طاقت کا سکہ رواں کر دیا تھا۔ تاریخی حیثیت سے اس قوم کے آثار دنیا سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں، لیکن جنوبی عرب میں کہیں کہیں پڑاؤں کے کھنڈر موجود ہیں جنہیں عادی کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ ایک مقام پر حضرت ہود علیہ السلام کی قبر بھی مشہور ہے۔ ۱۲۔ میں ایک انگریز شاعری افسر

بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور یہیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ اس نے کہا ”اے برادرانِ قوم! میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہو کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں متنبہ کرے؟ بھول نہ جاؤ کہ تمہارے رب نے نوح کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور تمہیں خوب تنوید کیا پس اللہ کی قدرت کے کرموں کو یاد رکھو۔“ یہ ہے کہ فلاح پاؤ گے۔“ انھوں نے جواب دیا ”کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم کیلئے اللہ کی عبادت کریں اور انھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ اچھا تو نے؟“ وہ غصہ جس کی تو میں دمکی دیتا ہے اگر تو سچا ہے۔“ اس نے کہا ”تمہارے رب کی پھکار تم پر پڑ گئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا۔ کیا تم مجھ سے اُن ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں اور جن کے لیے اللہ نے کوئی سزا نازل نہیں کی ہے؟ اچھا تو تم بھی انتظار کرو اور میں

(James R. Wellsted) کو حسنِ غراب میں ایک پرانا کتبہ ملا تھا جس میں ہود علیہ السلام کا ذکر

موجود ہے اور عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی تحریر ہے جو شریعتِ ہود کے پیرو تھے۔

مثلاً یعنی اسے دونوں حیثیتوں سے یاد رکھو، اس حیثیت سے بھی کہ اس نے قومِ نوح کو مٹانے کے بعد تمہیں اس کی جگہ سرہند کیا، اور اس حیثیت سے بھی کہ وہ کل تمہیں مٹا کر کسی اور قوم کو تمہارا جانشین بنا سکتا ہے۔

مثلاً یہاں یہ بات پھر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ قوم بھی اللہ سے منکر یا ناواقف نہ تھی اور نہ اسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا، بلکہ دراصل وہ حضرت ہود کی جس بات کو ماننے سے انکار کرتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اکیلے اللہ کی بندگی کی جائے کسی دوسرے کی بندگی اس کے ساتھ شامل نہ کی جائے۔

مثلاً یعنی تم کسی کو بارش کا اور کسی کو ہوا کا اور کسی کو دولت کا اور کسی کو بیماری کا رب کہتے ہو، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی فی الحقیقت کسی چیز کا رب نہیں ہے۔ کسی کا نام تم نے شکل کا رکھ دیا ہے حالانکہ شکل کٹائی کی کوئی طاقت اس کے

بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔“ آخر کار ہم نے اپنی ہیرانی سے ہو دیا اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے۔

پاس نہیں کسی کو تم گنج بخش کے نام سے پکارتے ہو حالانکہ اس کے پاس کوئی گنج ہی نہیں کہ کسی کو بخشے۔ کسی کے لیے تم دانا کاغذ بولتے ہو، حالانکہ وہ کسی شے کا مالک نہیں کہ دانا ہی سکے۔ کسی کو تم نے غریب نواز کے نام سے موسوم کر رکھا ہے، حالانکہ وہ اس اقتدار میں کوئی حصہ نہیں رکھتا جس کی بنا پر وہ کسی غریب کو نواز سکے۔ کسی کو تم خوش (ذریا درس) کہتے ہو حالانکہ وہ کوئی زور نہیں رکھتا کہ کسی کی فریاد کو پہنچ سکے پس درحقیقت ایسے سبب غم نام ہی ہیں جن کے پیچھے کوئی صحتی نہیں ہے۔ جہاں کے لیے جھگڑتا ہے وہ دراصل چند ناموں کے لیے جھگڑتا ہے نہ کہ کسی حقیقت کے لیے۔

سلف یعنی اللہ جس کو تم خود بھی رب اکبر تسلیم کرتے ہو، اس نے کوئی سند تمہارے ان بناوٹی خداؤں کی الہیت و ربوبیت کے حق میں عطا نہیں کی ہے۔ کہیں اس نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے فلاں فلاں کی طرف خدائی کا اتنا حصہ منتقل کر دیا ہے۔ کوئی پروانہ اس نے کسی کو شکل کثافی یا گنج بخشی کا نہیں دیا۔ تم نے آپ ہی اپنے دہم دگمان سے اس کی خدائی کا جتنا حصہ کچھ چاہا ہے دے ڈالا ہے۔

سلف جڑ کاٹ دی، یعنی ان کا تہیہ حال کر دیا اور ان کا نام و نشان تک دنیا میں باقی نہ چھوڑا۔ یہ بات خود اہل عرب کی تاریخی روایات سے بھی ثابت ہے، اور موجودہ اٹری انکشافات بھی اس پر شہادت دیتے ہیں کہ عباد اولیٰ بالکل تباہ ہو گئے اور ان کی یادگاریں تک دنیا سے مٹ گئیں، چنانچہ مورخین عرب انھیں عرب کی اہم باندہ (معدوم اقوام) میں شمار کرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی عرب کے تاریخی مسلمات میں سے ہے کہ عابد کافر وہ حصہ باقی رہا جو حضرت ہود کا پیر و تھا۔ انہی بقایا عابد کا نام تاریخ میں عاذانیہ ہے اور حصین خواب کا وہ کتبہ جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے انہی کی یادگاروں میں سے ہے۔ اس کتبہ میں جو ۱۸ سو برس قبل مسیح کی تحریر سمجھا جاتا ہے، ماہرین آثار نے جو عبارت پڑھی ہے اس کے چند جملے یہ ہیں:

”ہم نے ایک طویل زمانہ اس قوم میں اس شان سے گزارا ہے کہ ہماری زندگی

تنگی و بد حالی سے دور تھی، ہماری ہیریں دریا کے پانی سے بھر رہی تھیں۔“

(بیحدہ شہید) اور ہمارے حکمران ایسے بادشاہ تھے جو بڑے خیالات سے پاک

ادبائی شرف و فاد پر محنت تھے، وہ ہم پر ہمد کی تربیت کے مطابق حکومت کرتے تھے

اور عہد فیصلے ایک کن بنیں درج کر لیے جاتے تھے، اور ہم بھڑات اور موت کے بعد

دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان رکھتے تھے۔

یہ عبارت آج بھی قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ عادی قدیم عظمت و شوکت اور خوشحالی کے وارث آخر

کار وہی لوگ ہوں جو حضرت ہمد پر ایمان لائے تھے۔

حسب ذیل کتب چھپ چکی ہیں

رد مذاہم جماعت اسلامی حصہ اول

تقیات

قیمت ۲-۴-۰

قیمت ۱۳-۰

خطبات

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم

قیمت

قیمت

مختلف پمفلٹ بھی طبع ہو رہے ہیں

مکتبہ دارالاسلام جھاپور پٹھانکوٹ